مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

فی شمارہ پانچ روپے

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ　یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :- حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

UL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH.

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۴۸ ماہ صفر المظفر ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۱ء عدد ۳

مضامین

ضروری اعلان: ہر قسم کا چیک اور ڈرافٹ صرف دار المصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ کے نام آنا چاہیے۔ اڈیٹر یا کسی اور کے نام سے ہرگز نہ بھیجا جائے۔ "منیجر"

شذرات

گزشتہ ماہ روس میں بڑے دھماکہ خیز اور ڈرامائی واقعات رونما ہوئے، پہلے سوویٹ یونین کے صدر میخائیل گورباچوف کو ان کے عہدے سے اس وقت معزول کرکے نظر بند کر دیا گیا جب وہ بحر اسود کے کنارے تفریح بخش مقام کریمیا میں چھٹیاں گزارنے چلے گئے تھے، اور نائب صدر نے ان کا عہدہ سنبھال کر پورے ملک میں چھ ماہ کے لیے ایمرجنسی نافذ کر دی، تمام سیاسی سرگرمیوں، جلسے جلوس اور ہڑتال وغیرہ پر پابندی لگا دی، نظم و نسق چلانے کیلیے ایک آٹھ رکنی کمیٹی مقرر کر دی اور یہ جھوٹا اعلان بھی کیا کہ مسٹر گورباچوف اپنی خراب صحت کی وجہ سے صدارت کے فرائض انجام دینے سے معذور ہو گئے ہیں، ابھی اس واقعہ سے پوری دنیا میں ہلچل مچی ہوئی تھی کہ روسی عوام کی شدید مزاحمت اور رشین ری پبلک کے صدر بورس یلسن کی کھلی حمایت کی وجہ سے تین ۳ روز کے اندر ہی باغیوں کو سپر انداز ہونا پڑا، اور اب گورباچوف نے پھر حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر آٹھ رکنی ایمرجنسی کمیٹی کے فرمان منسوخ کر دیے، وہ اپنے مخالفین کا قلع قمع بھی کر رہے ہیں۔

۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں روس میں اشتراکی انقلاب آیا، اسی وقت سے وہاں ظلم و استبداد اور جمہوریت کشی کا دور شروع ہوا، لینن نے زار کی حکومت ختم کرکے شہنشاہیت کے آثار معدوم کر دینے کے لیے تشدد ہی کا طریقہ اپنایا تھا، اس کے بعد اس کے جانشین بھی اس کے نقش قدم پر چلتے رہے، اسٹالن کے ناقابل بیان مظالم کی قلعی اسی کے جانشین خروشچیف نے کھولی، گورباچوف کے دور میں جنگی تیاری، زرگری، ہوس ملک گیری، عام لوگوں کو کچلنے اور ان کی امنگوں کو دبانے میں کمی ہوئی، اور ملک کے باشندوں نے عرصۂ دراز کے بعد آزادی و جمہوریت کی فضا میں سانس لی، اور گورباچوف کے اصلاحی و انقلابی اقدامات سے راحت محسوس کی، اس دور میں تخفیف اسلحہ اور سوویٹ یونین کی مختلف ریاستوں کی آزادی و خود مختاری کے معاہدے ہوئے، دوسرے ملکوں سے روسی فوجوں کی واپسی ہوئی، افغانستان بھی ان سے خالی ہو گیا، دیوار برلن گرا دی گئی اور مشرقی و مغربی جرمنی ایک ہو گئے

لینن اور اسٹالن کے پرستاروں اور رجعت پسند کمیونسٹوں کو ان اصلاحات میں کمیونزم کا زوال صاف دکھائی دیتا تھا جو ان کے لیے ناقابل برداشت تھا، اسی لیے انھوں نے موقع پاتے ہی گورباچوف کے خلاف بغاوت کر دی، مگر ان کی اصلاحات اور جمہوری عمل کی عوامی مقبولیت کی وجہ سے بہت جلد فرو ہو گئی، اور اب وہ مزید طاقتور ہو کر کمیونزم کی بیخ کنی اور اپنے نقشے کے مطابق سوویٹ یونین کے نظام نو کی تشکیل میں مصروف ہو گئے ہیں، اس سے ان لوگوں کا حوصلہ بھی بڑھے گا جو ان کی سست رفتاری، اعتدال پسندی اور اصلاح کی تدریجی پالیسی کی وجہ سے بددل اور مایوس ہو گئے تھے، سوویٹ یونین میں کمیونزم سے بیزاری کی جو لہر اٹھی ہے اس کی بنا پر بالشویک انقلاب کی یادگار لینن گراڈ میوزیم مقفل کر دیا گیا، گورباچوف نے کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہو کر پارٹی کو توڑنے اور اس کے تمام اثاثوں کو ضبط کر لینے کا اعلان کیا ہے، ان کے خیال میں موجودہ حالات میں اشتراکی فلسفہ ناقابل عمل ہو گیا ہے، ایسے آثار دکھائی دے رہے ہیں کہ اب مشرقی یورپ سے کمیونسٹوں کی وسیع حکومت کے ختم ہونے کے دن آ گئے ہیں۔

سوویٹ یونین سے اشتراکیت کے خاتمہ کا عام خیر مقدم ہو رہا ہے، امریکہ کو اپنے حریف کے اپنی موت آپ مر جانے کی جتنی بھی خوشی ہو کم ہے، مگر اشتراکیت ہی کی طرح مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام بھی دنیا کے لیے امن و عافیت بخش نہیں ہے ع سکندری ہو، قلندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ
اشتراکیت سرمایہ داری ہی کا رد عمل ہے جو تشدد، دہشت گردی اور خونیں انقلاب کے ذریعہ دنیا کے ایک بڑے حصہ پر چھا گئی تھی لیکن زور زبردستی کے بل پر یہ غیر فطری و منفی نظام عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا تھا، سرمایہ داری بھی ایک غیر فطری اور منفی نظام ہے، اسے بھی اپنی چمک دمک دکھا کر ختم ہونا ہوتا ہے، گورباچوف اشتراکیت سے دستبردار ہو کر اس سے پینگیں بڑھا رہے ہیں لیکن سوویٹ یونین کے لوگ اشتراکیت کی طرح اس پر بھی راضی نہ ہوں گے اور جلد یا بدیر اسے پھر انقلاب سے دوچار ہونا پڑے گا دنیا کو اس وقت ان دونوں کی افراط و تفریط سے پاک اور اعتدال پر مبنی ایسے نظام کی ضرورت ہے

جو انسانوں کے بجائے خالق کائنات کا بنایا ہو، اور جس کا ایک نمونہ چودہ سو برس پہلے سامنے آچکا ہے، ہندوستان کے رہنمائے اعظم گاندھی جی بھی اسی کی تمنا لیے ہوئے دنیا سے چلے گئے، لیکن فیضان سماوی سے محروم لوگوں کی نگاہیں برق و بخارات سے آگے کہاں اٹھتی ہیں ؎

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہے محروم حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

---

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو عبادت گاہوں کی جو نوعیت و حیثیت تھی کانگریس آئی نے اپنے انتخابی منشور میں اسے برقرار رکھنے کا وعدہ کیا تھا، اب اس کی حکومت نے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے لوک سبھا میں اس کا بل پیش کیا ہے، جس سے صرف بابری مسجد کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے کیونکہ اس کا مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے، راشٹریہ مورچہ اور ترقی پسند جماعتوں نے بل کا خیر مقدم کیا ہے لیکن بی جے پی نے حسب توقع اس کی مخالفت کی ہے، ہندوستان میں مسجد و مندر کے جھگڑے نے جو قیامت ڈھائی ہے اس سے اور ملک کو مزید تباہی و رسوائی سے بچانے کے لیے یہ بل لانا نہایت ضروری ہوگیا تھا جو توقع ہے کہ جلد ہی منظور بھی ہو جائے گا، کانگریس آئی اور وزیر اعظم نرسمہا راؤ اس بروقت اور مناسب اقدام پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

فسطائی عناصر اور رجعت پسند جماعتوں نے مسلمانوں کے مذہب و کلچر کو مٹانے کی جو مہم چلا رکھی ہے اس کا ایک اہم جزء مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا مطالبہ بھی ہے، ۱۹۸۶ء میں اس کے بارے میں سارے مسلمانوں کے اتفاق نے لوک سبھا میں ترمیمی بل لانے کے لیے حکومت کو مجبور کر دیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی عدالتوں کی من مانی کارروائی جاری ہے، حال ہی میں آندھرا پردیش ہائی کورٹ میں جب اسی طرح کا ایک مقدمہ پیش ہوا تو اس نے ترمیم شدہ دفعہ اور شاہ بانو کیس کے پس منظر اور اسلامی شریعت کے دلائل و شواہد کی روشنی میں یہ عادلانہ فیصلہ دیا کہ عدت گزرنے کے بعد شوہر سے نان نفقہ کے لیے مطلقہ کا مطالبہ درست نہیں، بلکہ یہ قانون کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہے، قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کا حق صرف معتبر علماء و مفسرین ہی کو حاصل ہے جس کی پابندی عدالتوں کیلئے بھی لازمی ہے، اس واضح اور صریح فیصلہ کے بعد ہر ایک کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت سے باز رہنا چاہیے۔

مقالات

علامہ شبلی اور سیرت نبوی کی تالیف

مقدمۂ سیرت پر ایک نظر

ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

۵۔ پانچویں وجہ مولانا شبلیؒ نے یہ بتائی ہے کہ ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے اور نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اس باب میں وہ اہل یورپ کے طریقہ کو نہایت غیر معتدل بتاتے ہیں کہ وہ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتے ہیں اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلولات پیدا کرتے ہیں لیکن اس میں بہت کچھ ان کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے اس کے برخلاف اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرف داری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں کہ ان کا اثر مذہب اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلہ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے، مولانا شبلیؒ کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں حد سے زیادہ تفریط ہوگئی، چنانچہ اس سے بچنے کے لیے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا اور واقعہ کو

خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے، مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کر دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں لیکن اسکے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے اس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں اس سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

۶۔ مولانا شبلیؒ کو یہ شکایت بھی ہے کہ ارباب سیر نے نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم کیا، ان کے نزدیک اس کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیے کہ نوعیت واقعہ کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ ایک راوی جو ثقہ ہے ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا ہے اور پیش آسکتا ہے تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائے گی لیکن وہی راوی جب ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو غیر معمولی ہے، تجربہ عام کے خلاف ہے، گردوپیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاج ثبوت ہے، اس لیے اب راوی کا معمولی درجہ وثوق کافی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل، زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ داں ہونا چاہیے۔

مولانا شبلیؒ بتاتے ہیں کہ اکثر محدثین کے نزدیک ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کر سکتا ہے، اگر کسی صحابیؓ نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کی روایت کی تو قابل اعتبار ہوگی، استدلال یہ ہے کہ محمود بن ربیع صحابی

آپؐ کی وفات کے وقت پانچ برس کے بچے تھے، آپؐ نے ایک دفعہ اظہار محبت کے طور پر ان کے منہ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا، اس واقعہ کو انھوں نے جوان ہو کر لوگوں سے بیان کیا اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہوا کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول کی جا سکتی ہے لیکن بعض محدثین کی رائے ہے کہ کمسن کی روایت قابل حجت نہیں، شوافع کی یہی رائے ہے، عبداللہ بن مبارکؒ بھی بچہ کی روایت حدیث قبول کرنے میں توقف کرتے ہیں۔ مولانا شبلیؒ کے نزدیک اثبات و نفی دونوں پہلو بحث طلب ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ۵ برس کا بچہ اگر یہ واقعہ بیان کرے کہ فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے یا وہ بوڑھا تھا، اس نے مجھ کو گود میں لیا کھلایا تھا تو اس روایت میں شبہ کرنے کی وجہ نہیں، لیکن وہی بچہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا تو شبہ ہوگا کہ بچہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں، مولانا شبلیؒ کہتے ہیں کہ فقہا نے تو اس نکتہ کو ملحوظ رکھا، لیکن عام طور سے اس اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

مصنف سیرۃ النبیؐ نے اس پر بھی بحث کی ہے جو صحابہؓ فقیہ نہ تھے انکی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو تو واجب العمل ہوگی یا نہیں، انھوں نے بعض علما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے مطلب کے سمجھنے میں غلطی کی ہو اس سے معاذ اللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابہؓ کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔

مولانا شبلیؒ محدثین کے متعلق بتلاتے ہیں کہ وہ اس اصول سے بے خبر نہ تھے کہ واقعہ جس درجہ کا اہم ہو شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہیے، ابن مہدی کا قول ہے کہ جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت

کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں لیکن جب فضائل اور ثواب و عقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انکاری کرتے ہیں اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں، امام احمد بن حنبلؒ نے ابن اسحاق کی نسبت یہ تفریق کی کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جاسکتی ہیں لیکن حلال وحرام میں ان کی شہادت کو معتبر نہیں مانتے، مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ یہ وہی اصول ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیے اور یہ کہ واقعہ بدلنے سے شہادت کی اہمیت بدل جاتی ہے لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ واقعہ کی اہمیت احکام فقہیہ کے ساتھ مخصوص نہیں، فقہائے احناف کے متعلق مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ نوعیت واقعہ کی اہمیت کو انھوں نے ملحوظ رکھا، ان کا مذہب ہے کہ جو روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہیے کہ راوی فقیہ و مجتہد بھی ہے یا نہیں، اگر تفقہ و اجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدین یا عبادلہ تھے تو اس کی حدیث حجت ہوگی اور اس کے مقابلہ میں قیاس چھوڑ دیا جائے گا اور اگر راوی ثقہ اور عادل ہے لیکن فقیہ نہیں تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے گا خواہ صحابیؓ ہی کی روایت کیوں نہ ہو۔

۷۔ مولانا شبلیؒ کے نزدیک سب سے اہم یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے وہ کہتے ہیں کہ تفحص واستقرا سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ اس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں، مولانا کا بیان ہے کہ اس کی

بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں، ایک مثال ملاحظہ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ازواج سے ناراض ہو کر تنہا نشیں ہو گئے تھے تو یہ مشہور ہوا کہ آپؐ نے ازواج کو طلاق دیدی، حضرت عمرؓ نے یہ خبر سنی تو مسجد نبویؐ میں آئے جہاں لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ آپؐ نے طلاق دیدی، حضرت عمرؓ نے خود آپؐ سے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے طلاق نہیں دی۔

مولانا شبلیؒ کا بیان ہے کہ یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ باختلاف الفاظ مذکور ہے کتاب النکاح کی روایت کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے جو کچھ لکھا ہے اسے نقل کرنے کے بعد مولانا اس کی جانب توجہ دلاتے ہیں کہ مسجد نبویؐ میں تمام صحابہؓ جمع ہیں اور سب بیان کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دے دی، صحابہؓ عموماً ثقہ اور عادل ہیں اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے، باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا، حافظ ابن حجرؒ نے بڑی جرأت کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ راوی اول منافقین میں سے ہوگا۔

مولانا شبلیؒ حضرت عائشہؓ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں جن میں سے ایک واقعہ افک ہے، انکی نسبت بھی قیاس کرنا چاہیے کہ منافقین نے ان کی طرف منسوب کر دیے ہوں گے پھر مسلمانوں میں پھیل گئے۔

۸۔ آٹھویں چیز یہ بیان کی ہے کہ فن تاریخ پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کو ہمیشہ اس پر فخر رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا، یہی وجہ

ہے کہ امویوں اور عباسیوں کے دور میں جہاں حدیثیں وضع کی گئیں وہاں اسی زمانہ میں
محدثین نے علانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی حدیثیں ہیں اس لیے آج حدیث کا فن
اس خس و خاشاک سے پاک ہے۔ مگر اس کے باوجود مولانا تسلیم کرتے ہیں کہ یہ
عالمگیر موثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، مغازی میں اس کے نشانات
پائے جاتے ہیں،

وہ تاریخ نگاری کے اس قدیم طریقہ کا ذکر کرتے ہیں کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں
کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم و نسق اور تمدن و معاشرت کے واقعات یا تو
بالکل قلم انداز کر جاتے تھے یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں
پڑتی تھی، مولانا بتاتے ہیں کہ اسلام میں جب تالیف و تصنیف کی ابتدا ہوئی تو یہی
نمونے پیش نظر تھے اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھا گیا، ان کتابوں کی
ترتیب یہ بتائی ہے کہ سلاطین کی طرح سنین کو عنوان بنایا ہے اور اسی ترتیب سے حالات
لکھے ہیں، یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں
شروع کرتے ہیں۔

مولانا شبلی کے نزدیک یہ طریقہ سلطنت و حکومت کی تاریخ کے لیے بھی صحیح نہیں ہے
اور نبوت کی سوانح نگاری کے لیے تو ناموزوں ہے، وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کو ناگزیر طور پر
جنگی واقعات پیش آتے ہیں اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے
رنگ میں نظر آتا ہے لیکن مولانا شبلی کہتے ہیں کہ یہ پیغمبرؐ کی اصلی صورت نہیں، اس کی
زندگی کا ایک ایک خط و خال تقدس، نزاہت، حلم و کرم، ہمدردی عام اور ایثار
ہوتا ہے بلکہ عین اس وقت جب کہ اس پہ سکندر اعظم کا دھوکا ہوتا ہے ژرف بیں نگاہ

فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتہ یزدانی ہے۔
اس موقع پر اس کی وضاحت بھی کی ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں
سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے۔

۹۔ مولانا شبلیؒ اس کو نہایت مہتم بالشان بحث بتاتے ہیں کہ کوئی روایت اگر
عقل یا مسلمات یا دیگر قرائن صحیح کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہو گی
یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں اور سلسلۂ سند متصل ہے، مولانا پہلے علامہ ابن جوزیؒ کا یہ
خیال نقل کر چکے ہیں کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو اس کے رواۃ کی جرح و تعدیل کی
ضرورت نہیں مگر مولانا کہتے ہیں کہ عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے، حامیانِ روایت
کہتے ہیں کہ اگر اس کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا انکار
کر دے گا کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے، اس بنا پر اس بحث کا قطعی فیصلہ
کرنا مشکل ہے، عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور
سلسلہ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو وہ باوجود خلاف عقل ہونے کے انکار کے
قابل نہیں جیسے تلک الغرانیق العلی کی حدیث کو بعض محدثین نے ضعیف اور
ناقابل اعتبار کہا ہے کیونکہ اس میں اس کا بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دے جن میں بتوں کی تعریف ہے
مگر حافظ ابن حجرؒ اس کو بے اصل نہیں مانتے، اسی طرح صحیح بخاری کی حدیث میں حضرت
ابراہیمؑ کے تین دفعہ جھوٹ بولنے کا ذکر ہے، امام رازیؒ نے اس کا انکار کیا ہے۔
اور لکھا ہے کہ "اس سے حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے اس لیے زیادہ
آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں" لیکن علامہ

قسطلانی انکے قول کو بالکل ہیچ بتاتے ہیں۔

جو لوگ دلائل عقلی اور قرائن حالی کی بنا پر بعض حدیثوں کو تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں ان میں صحابہ کرامؓ بھی ہیں اور انکے بعد کے محدثین بھی، مولانا نے دونوں جماعتوں کے مختلف اشخاص کے بارہ میں بتایا ہے کہ انھوں نے دلائل عقل و نقل کی وجہ سے بعض حدیثیں تسلیم نہیں کی ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث پر اسی لیے تنقید کی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس سے اور اس قسم کے بہت سے واقعات سے مولانا شبلیؒ کے نزدیک ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر محدثین سلسلۂ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اسکے موافق ہیں کہ نہیں؟

۱۰۔ روایت بالمعنی کو مولانا شبلیؒ نے ایک بڑا مرحلہ بتایا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ نے جو الفاظ فرمائے تھے بعینہ وہی ادا کرنے چاہئیں یا ان کا مطلب ادا کر دیا جانا کافی ہے، محدثین اس بارے میں مختلف الرائے ہیں اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا تو الفاظ کی پابندی ضروری نہیں لیکن مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا ایک اجتہادی بات ہے اسی بنا پر بعض محدثین ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے مگر عام حالت یہی تھی کہ راوی حدیث کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے اور جو صحابہؓ بہت محتاط تھے حدیث کی روایت کے وقت ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی اور وہ آپؐ سے زیادہ روایت کرنے سے بھی پرہیز کرتے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے خبردار فرمایا ہے، مولانا شبلیؒ ان سب کی

تفصیل تحریر کرنے کے بعد بتاتے ہیں کہ یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے،

اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہو سکتا لیکن وہ بتاتے ہیں کہ ثقہ راوی سے بھی مطلب سمجھنے یا ادا کرنے میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر کیا جاتا ہے، حضرت عائشہؓ کے سامنے جب عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت بیان کی گئی۔

ان المیت لیعذب ببکاء الحی   مردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا "تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو، نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں لیکن کان غلطی کر جاتا ہے"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا "وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی"۔

۱۱۔ روایت آحاد: وہ ہے جس کے سلسلہ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو یعنی کوئی دوسرا راوی اس کا مؤید نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و ظنی ہونے کے متعلق اہل فن کا اختلاف ہے، مولانا شبلیؒ اس سے معتزلہ کے انکار کو انکار بداہت کہتے ہیں اور اس کی صحت و قطعیت کے متعلق محدثین کے قول کو تفریط اور صحابہؓ کے طرز عمل کے مخالف بتاتے ہیں اور اس کی بعض مثالیں پیش کر کے بتاتے ہیں کہ احاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت، رواۃ کے ثقہ و معتبر ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے

ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ زید نے تم کو بلایا ہے تو راوی کی ثقاہت و اعتبار کے مسلّم ہونے کے بعد ہم کو کبھی اس واقعہ کی صحت تسلیم سے انکار نہیں ہوتا لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے تو ہم اس واقعہ کی صحت کی تسلیم میں پس و پیش کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لیے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں۔

مقدمہ کے آخر میں یورپین تصنیفات کا ذکر بھی ہے، مولانا شبلیؒ کا خیال تھا کہ ان پر پوری اور مکمل بحث کسی اور حصہ میں کر کے بتائیں گے کہ ان کا عام انداز کیا ہے، ان کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں، ان کے وسائلِ معلومات کس درجہ کے ہیں، اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں، تعصب اور سوئے ظن کا کہاں تک اثر ہے، زیر نظر مقدمہ میں جو اجمالی گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔

پہلے وہ یہ بتاتے ہیں کہ ایک مدت تک یورپ اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا اور جب جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجیب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، سترہویں صدی کے سنین وسطی کو وہ یورپ کے عصرِ جدید کا مطلع بتاتے ہیں اس دورِ حریت و آزادی میں مستشرقینِ یورپ سامنے آئے جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شایع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس علمی و سیاسی اغراض سے جابجا ملک میں قائم ہوئے اور اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ الگ ہو گئیں، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و غیر متعصب گروہ۔

اخیر اٹھارہویں صدی کے زمانہ کے بارے میں مولانا نے بتایا ہے کہ یورپ کی سیاسی قوت اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہو گئی جس نے اورینٹلسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی جنھوں نے حکومت کے اشارہ پر السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کیے۔ اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔ مسلمانوں کے یہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں وہ ایک ایک کر کے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا۔

مولانا شبلیؒ بتاتے ہیں کہ اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت، ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفینِ تاریخ اسلام اور سوانح نگارانِ پیغمبر عرب کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا، مولانا نے تقریباً ڈھائی صفحوں میں ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کیا ہے جو بہ تخصیص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں یا اسلام کے اصولِ عقائد پر لکھی گئی ہیں۔ پھر مولانا مصنفینِ یورپ کی تین قسموں کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ جو عربی زبان اور اصلی ماخذوں سے واقف نہیں ان کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلانِ طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں مولانا ان میں سے

بعض جیسے گبن صاحب ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست کا ذکر کرکے فرماتے ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں سے بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں، لیکن قلیل ما ھم۔

۲۔ دوسرے گروہ کے لوگ عربی زبان اور علم ادب و تاریخ و فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں۔ ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی تصنیف نہیں لکھی لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں اس میں جرمن کے مشہور فاضل **ساخو** اور **نولدیکی** کا ذکر کیا ہے، اور ان کے تعصب اور جہالت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

۳۔ وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، اس گروہ میں مولانا نے پامر صاحب اور مارگولیتھ کے بارے میں بتایا ہے کہ باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ع

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مولانا نے موخرالذکر کے عظیم کارنامے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ پروفیسر موصوف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب و افترا اور تاویل و تعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کرسکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوسکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنادیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر کے اعتراف کمال کے بعد ان کے متعلق فرماتے ہیں "لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہوکر رہ گئے"۔

مولانا کے نزدیک یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض اور وجوہ بھی ہیں جن کی بنا پر ان کو معذور رکھا جاسکتا ہے۔

۱۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری، ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفات سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو اسناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو۔

مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ مصنفین سیرت سے قطع نظر سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں عموماً ضعیف الروایت ہیں اس لیے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہوسکتی ہے لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے ان کے لیے یہ سرمایہ کارآمد نہیں۔

مولانا شبلی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے (مارگولیتھ) تو اوّلاً تو اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے

کے لیے کافی ہے۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور مسلمانوں کے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا ہے کہ راوی صادق ہے یا کاذب؛ اسکے اخلاق و عادات کیا ہیں، حافظہ کیسا ہے؛ اسکے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کر لی جائے گی۔ اسکے بخلاف مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اسکی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ اسمائے رجال کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو انکے نزدیک اسکا بیان ناقابل اعتنا ہے اور بخلاف اسکے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن و قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو لیکن اس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔

مولانا شبلیؒ اسکی مثال دیتے ہوئے واقدی کا نام لیتے ہیں کیونکہ اس کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں سب موجود ہوتی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جو روایتیں سو ڈیڑھ سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہی ہیں ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں چند واقعات کا

ذخیرہ سامنے رکھکر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے لیکن یہ جدت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم ہر موقع پر مولانا محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں سمجھتے کیونکہ ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کیے ہیں اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں انکی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپ کے تعلق سے آخری بات "یورپین تصنیفات کے اصول مشترکہ" کے عنوان سے لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں یا انکی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آپؐ کی زندگی مکہ تک پیغمبرانہ ہے لیکن مدینہ جاکر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتاً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خوں ریزی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۲) کثرت ازدواج اور میل الی النساء

(۳) مذہب کی اشاعت جبر اور زور سے۔

(۴) لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

(۵) دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

ان کو بیان کرنے کے بعد وہ ناظرین کو اس نکتہ پر نظر رکھنے کی تلقین فرماتے ہیں کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار میں بھی ٹھیک اتر سکتے ہیں یا نہیں؟

مولانا شبلیؒ نے اپنی سیرۃ النبیؐ میں جو اصول اختیار کیے ہیں، آخر میں انہیں نمبروار بیان کیا ہے جن کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔

۱۔ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے وہ سب پر مقدم اور

سب سے بالاتر ہے انکے نزدیک بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن آیات قرآنی پر اچھی طرح نظر نہ ڈالنے کی وجہ سے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

۲۔ قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے مولانا نے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں انکے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایات کی کوئی ضرورت نہیں، کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں، اگر علم استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، مولانا شبلیؒ اپنی کتاب کی بڑی خصوصیت یہی بتاتے ہیں کہ اکثر تفصیلی واقعات انھوں نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کیے ہیں جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔

۳۔ روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں وہ کافی خیال کرتے ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں انکے متعلق تحقیق و تنقید سے کام لیتے ہیں اور تا امکان کد و کاوش کرتے ہیں۔

۴۔ جن فروگزاشتوں کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے جہاں تک ممکن تھا مولانا نے انکی اصلاح و تلافی کی ہے سب سے آخر میں حوالوں اور ماخذ کے متعلق بتایا ہے کہ۔

۱۔ تاریخ و روایت میں یہ سب سے مقدم چیز ہے اس لیے صرف انہی کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے جو ان کی نظر سے گزری ہیں۔

۲۔ جو واقعات کسی قدر اہم ہیں انکے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کد و کاوش کی ہے۔

۳۔ مطبوعہ کتابوں کے حوالے میں مطبع کے نام کی صراحت کر دی ہے، قلمی کتابوں کے متعلق تصانیف سیرت کی جو فہرست سیرت کے آغاز میں دی ہے، اسی میں واضح کر دیا ہے کہ مصنف کے استعمال میں کونسا نسخہ تھا۔

اُردو کی مناجاتی شاعری

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

(۲)

پچھلے صفحات میں کہا گیا ہے کہ محلوں اور درباروں کے علاوہ تصوف اور خانقاہی نظام بھی شاعری کی پرورش و پرداخت کے لیے بڑا مفید رہا ہے، اس کی بدولت اردو شاعری کے قالب میں مذہب کی روح داخل ہو گئی، خواجہ میر درؔد (م ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء) کی شاعری صوفیانہ تھی۔ اگرچہ دردؔ کے دیوان میں سبھی کچھ ہے۔ مادی عشق کی سرشاری و سرمستی بھی اور خالق یکتا و حقیقی سے انسیت و محبت کی فراوانی بھی، لیکن بشری کمزوریوں کے حامل اشعار چھانٹ لیے جائیں تو خالص تصوف و مذہبیت ان کے دیوان کی اصل خصوصیت معلوم ہونے لگے گی۔ دراصل تصوف کی چاشنی اور اس کی لطافت و سرمستی نے درد کی شاعری کو جو آہنگ بخشا اور ان کی حسرت زدگی کے انداز نے شاعری میں جو رنگ پیدا کر دیا اس سے انکے عہد کی شاعری بہ استثنائے میرؔ بے رنگ ہو کر رہ گئی۔ درد کی شاعری ایسی تاثیر سے معمور ہے جس میں مجاز و حقیقت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس میں حیرت و استغراق کا اظہار بھی ہے اور حسرت و یاس سے مملو افکار بھی۔ وہ ربّ العٰلمین پر کس حسرت و یاس اور سرمستی کے عالم میں نالۂ آہ سر کرتے ہیں۔

مجھے در سے اپنے تو ٹالے ہے، یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں ؛؛ کوئی اور بھی ہے ترے سوا؟ تو اگر نہیں تو جہاں نہیں[1]

---

[1] خواجہ میر درؔد (مرتبہ رشید حسن خاں) "دیوان درؔد" دہلی ص ۶۰۔

یہ شعر ان کے دل کی انتہائی گہرائی سے نکلا ہوا ہے جو تاثیر کے لحاظ سے بڑی بڑی
مناجاتوں پر بھاری ہے۔

درد کے کم و بیش سو سال بعد اسد اللہ خاں غالب اپنے "آدھے مسلمان ہونے کا
اعلان کرتے ہیں۔ وہ باوجود "موحد" ہونے اور "کیش ترک رسوم" کا دعویٰ کرنے کے
نہایت تشکک انداز میں خدا سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں ع کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
اور ع پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

غالب کے حمدیہ اشعار کا تجزیہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ چونکہ وہ اپنی زندگی میں
ناکامیوں اور پریشانیوں کا سامنا کرتے رہے تھے، اس لیے ان کے یہاں تشکیک،
تلخی، شکست خوردگی اور نامرادی پیدا ہوگئی تھی۔ یاس اور ناکامی کی اس کیفیت کے
زیر اثر غالب خدا کو بھی طنزیہ انداز میں مخاطب کرتے ہیں، لیکن جہاں خدا سے مانگنے
کی نوبت آجاتی ہے تو وہی جری غالب خدا کے سامنے مجسم مغلوب اور سراپا عجز بن جاتے ہیں۔

غدر کے بعد دلی کے اجڑتے ہوئے ماحول سے گھبرا کر استادان فن وہاں سے
رخت سفر باندھتے ہیں۔ پورب (لکھنؤ) کے ساکنین ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ چنانچہ دلی
کی ساری رعنائیاں و رنگینیاں اب لکھنؤ میں عود کر آتی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی
نے اس دور کے لکھنؤ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

"ہر لب پہ گل کا افسانہ، ہر زبان پہ بلبل کا ترانہ، ہر سر میں عشق کا سودا،
ہر سینے میں جوشِ تمنا ...... ضلع جگت اور تالیاں۔ قہقہہ اور گلے بازیاں۔ ہر طرف
رندی و مستی کا جوش و خروش۔ ہر گوشہ بساطِ دامان باغبان و گل فروش"[1]

[1] عبدالماجد دریاآبادی "اردو کا ایک بدنام شاعر" مشمولہ کلیات مرزا شوق (مرتبہ عبدالسلام) ۱۹۶۷ء ص ۳۵۔

اس "جنت نظر" اور "فردوس گوش" فضا میں اگرچہ آسودگی اور تعیش پسندی کا دور
دورہ تھا لیکن مذہبی رواداری بھی باقی تھی۔ چنانچہ اثنا عشری عقائد کے تحت میر انیس
(م ۱۸۷۴ء) اور مرزا دبیر فریضۂ مذہبی کی بجا آوری کے لیے مجلس تولا و تبرا سجاتے ہیں۔
وہ مناقب حسنین و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ ہی حمد و مناجات کی زمزمہ خوانی میں
بھی مصروف رہتے ہیں۔ لکھنؤ اس دور میں چونکہ شاعری کا مرکز تھا، گھر گھر شاعری
کے چرچے تھے۔ مناسبتِ لفظی، ضلع جگت، ایہام گوئی اور حاضر جوابی کے ماحول میں انیس
بھی اللہ رب العزت سے "اعجاز بیانی" کا مطالبہ کرتے ہیں۔

یارب! چمنِ نظم کو گلزار ارم کر — اے ابر کرم! خشک زراعت پہ کرم کر
توفیق کا مبدا ہے، توجہ کوئی دم کر — گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے[1]

آخری شعر میں "مناسبت لفظی" کے تحت "اقلیم سخن" کے ساتھ "قلمرو" آیا ہے قلم اور
سخن میں لفظی مناسبت ہے، جس کے برجستہ استعمال سے شعر میں لفظی حسن پیدا ہوگیا ہے۔
دراصل انیس جس ماحول میں سانس لے رہے تھے اس میں لذت کوشی اور عیش پروری
کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں شاعری میں بھی داخلیت کے بجائے خارجیت اور
معنویت کے بجائے الفاظ کی صورت گری ہی کی اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے
ہیں کہ اس دور کے لکھنوی شعراء کی اکثریت معنویت کے علی الرغم پر شکوہ الفاظ کی
صورت گری کرتی ہے۔ لیکن انیس نے صوری حسن کے ساتھ ہی معنوی صداقت کا

[1] مرزا انیس (مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری) "باقیات انیس" لکھنؤ جلد اول ص ۱۔

بھی خیال رکھا ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں اردو تہذیب "مد" سے "جزر" کی طرف لوٹنے لگی تھی۔ میر کی پرکاری غالب کا طلسم گنجینۂ معنی اور مومن کا سحر حلال کوئی بھی انگریزوں کے کالے جادو پر اثر انداز نہ ہو سکا تو مولانا الطاف حسین حالی (م ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء) "میر کا درد، شیفتہ کی سادگی اور غالب کا انداز بیان" اپنا کر سر سید کی ہمنوائی میں اصلاح قوم کی خاطر بارگاہ ایزدی میں فریاد کناں ہوتے ہیں۔

انہیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے — ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دے

کمیں گاہ بازئ دوراں دکھا دے — جو ہونا ہے کل، آج ان کو سجھا دے

چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے

سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے[1]

دراصل حالی نے مناجاتی شاعری کی تجدید کی ہے، ان کی "مناجات بیوہ" سے اردو کی مناجاتی شاعری کو گویا مہمیز ملی ہے۔ شعرائے متوسطین نے جس صنف کو پس پشت ڈال دیا تھا اور جدید شعرائے جسے لائق التفات نہیں سمجھا تھا حالی نے اسے دوبارہ قوت بخشی اور نئے انداز میں اسے متعارف کرایا۔ "مناجات بیوہ" جو مثنوی کی شکل میں ہے شیفتہ کے فطری انداز، میر کی دل گدازی، سر سید کی سادگی اور ظفر کی آہ و زاری کا گویا مرقع ہے اور جیسا کہ حالی نے اپنے مقدمہ میں شعر کی اثر آفرینی پر زور دیا ہے، مناجات لکھ کر اس کی مثال پیش کر دی ہے۔

[1] الطاف حسین حالی (مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی) کلیات نظم حالی لاہور ۱۹۷۰ء جلد دوم ص ۱۷۶۔

ہندوستان میں مسلمان غالب قوم کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے، لیکن یہاں کی تہذیب نے انہیں مغلوب کر دیا۔ مقامی معاشرت کی کئی رسمیں مسلم معاشرے میں ایسی در آئیں کہ اصلاح کی کوششوں کے باوجود وہ ختم نہیں ہوئیں۔ بیوہ کے نکاح ثانی کا عدم تصور بھی ایسی ہی ایک جاہلانہ رسم تھی۔ حالانکہ اسلام میں خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے علاوہ باقی تمام ازواج مطہرات سے بیوگی کی حالت میں نکاح کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ غلط رسم مسلم معاشرے میں بھی پوری طرح موجود تھی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۷۶۲ء) کی اصلاحی تحریک کو آگے بڑھانے والوں میں سید احمد بریلویؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دوسرے علمائے کرام نے اس قبیح رسم کا قلع قمع کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ سر سید احمد خاں نے اصلاح قوم کیلئے "تہذیب الاخلاق" رسالہ جاری کیا۔ حالی نے جو سر سید کے مشن سے بخوبی واقف تھے اور مذہبی جذبہ بھی بدرجہ اتم رکھتے تھے، ولی اللہی تحریک اور سر سید کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہو کر "بیوہ کے نکاح ثانی" کا خیال دلوں میں مضبوط بٹھانے کے لیے نہایت موثر انداز میں ایک مناجات لکھی، جس میں بیوہ کی تمام کیفیات اس کے نسوانی جذبات و خواہشات اور ظاہری و باطنی درد و الم کا برملا اظہار نہایت رقت خیز انداز میں کیا گیا ہے۔ اس مناجات کی اثر آفرینی کا یہ حال تھا کہ اس کے ترجمے ہندی اور سنسکرت[1] کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی ہوئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ باوجود مرد ہونے کے حالی نے کس بیوہ کے صحیح جذبات و احساسات کو اس طرح محسوس کیا جیسے یہ

[1] الطاف حسین حالی (مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی) کلیات نظم حالی لاہور ۱۹۷۰ء جلد اول ص ۵۹۔

سب کچھ ان پر بیت چکا ہو۔ شعرائے جدید میں تنہا حالی نے طبقۂ نسواں کی ہمدردی
اور دل سوزی میں طویل نظمیں لکھیں اور ان کے مسائل پر صدق دل سے عام لوگوں کو
غور وفکر کرنے کے لیے ابھارا۔ ایک اور نظم "چپ کی داد" میں بھی حالی نے نسوانی
مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان دونوں نظموں میں مظلوم طبقۂ نسواں کی وکالت موثر
انداز میں کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اپنانے کی دعوت دی گئی ہے۔

جس طرح "مناجات بیوہ" کی ادبی حیثیت مسلم ہے، اسی طرح مناجاتی شاعری
میں بھی وہ بے نظیر ہے۔ بارگاہ ایزدی میں دعا کے جو آداب ہیں۔ حالی نے ان سب کا
اہتمام اس مناجات میں پابندی کے ساتھ کیا ہے، تضرع، عجز، خاکساری اور
رجوع الی اللہ والی کیفیت دعا میں ضروری سمجھی گئی ہے۔ اس معیار پر بھی "مناجات
بیوہ" پوری اترتی ہے۔ مناجات کی ابتدا حمد سے ہونا لازمی ہے۔ حالی نے اپنی
مناجات میں اس کا بھی اہتمام کیا ہے۔

اے سب سے اول اور آخر — جہاں تہاں حاضر اور ناظر
ناؤ جہاں کی کھینے والے — دکھ میں تسلی دینے والے
میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں، جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
آبادی جنگل کا نمونا — دنیا سونی اور گھر سونا[1]

مندرجۂ بالا اشعار میں حالی نے معاشرے میں تڑپتی ہوئی بیوہ کی تمام

[1] الطاف حسین حالی، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، کلیات نظم حالی لاہور، ۱۹۷۰ء جلد دوم صفحات ۵ ـ ۱۳ ـ ۱۵ ـ

نفسانی اور جذباتی کیفیات کو پیش کر دیا ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے
سماج میں بیوہ کس طرح کس مپرسی اور بدترین حالت میں زندگی گذارنے کے لیے
مجبور کر دی جاتی تھی۔ ایسے سفاک اور ظالم سماج میں بیوہ کے لیے امید کی آخری کرن
اور سہارا در الٰہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ حالی نے "مناجات بیوہ" لکھ کر دراصل ساری
بیواؤں کو یہی در کھٹکھٹانے کے لیے اکسایا ہے اور اپنی رام کہانی اسی کی بارگاہ میں سنانے
کی تلقین کی ہے۔ اس طرح حالی کی یہ مناجات اردو کی مناجاتی شاعری کا گل سرسبد ہے۔

حالی کے معاصرین میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی (م ۱۹۱۷ء) نے بھی مناجاتیں لکھی ہیں۔
ان کا کلام سادگی کا عمدہ نمونہ اور پاکیزہ جذبات سے مملو ہے۔ گو یہ "ادب الاطفال"
کے زمرے میں آتا ہے، لیکن یہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی شاعری اپنی
سلاست وسادگی اور لطافت وشیرینی کی وجہ سے قاری کے قلب وذہن پر گہرے
اثرات مرتب کرتی ہے۔ مناجاتوں میں اسمٰعیل میرٹھی حمدیہ اشعار اکثر بڑی تعداد میں
پیش کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنا مدعا الٰہ العٰلمین کی بارگاہ میں صرف چند لفظوں میں
بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی مناجاتیں لفظی ومعنوی صنعت وآرائش سے خالی ہونے
کے باوجود موثر اور دلآویز ہیں۔

خدایا مری خواہشوں پر نہ جا — جو تیری رضا ہے وہی ہے بجا
تقاضا مرا سخت معیوب ہے — جو مرضی ہے تیری وہی خوب ہے[1]

حالی اور شبلی کے صحبت یافتہ سید وحیدالدین سلیم (م ۱۹۲۸ء) کی شاعری بھی اعلیٰ
مقاصد اور مفید خیالات کا مجموعہ ہے۔ "افکار سلیم" میں درج دعا ان کے افکار عالیہ کا

[1] اسمٰعیل میرٹھی: "کلیات اسمٰعیل میرٹھی"، میرٹھ ۱۹۱۰ء ص ۲۴۹۔

پتہ دیتی ہے۔ اس میں شاعر نے اپنی ذات کی اصلاح کے ساتھ ہی اپنے احباب کی اصلاح کے لیے کتنی سادگی و پرکاری سے دعا مانگی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

ڈال دے میری صدا سے کھلبلی احباب میں　　بھر دے برقِ زندگی انکے دلِ بیتاب میں
زندگی کے ساغروں میں منتقل کر دے انہیں　　گردشیں، طوفان نے دیکھی ہیں جو گرداب میں[1]

سلیم، اقبال کی طرح اضطراب کے قائل ہیں۔ اقبال نے جس طرح قوم کے نوجوانوں کو "طوفان سے آشنا" کرا دینے کی دعا کی تھی، تاکہ بحرِ حیات میں اضطرار و تموج رہے، اسی طرح سلیم نے بھی دعا کی ہے کہ خدایا! میرے احباب کے زندگی کے ساغروں میں گردشیں اور طوفان منتقل کر دے۔

علامہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) کا فلسفۂ دعا بڑا عجیب و غریب ہے انکے نظریہ کے مطابق دعا کے ذریعہ خدا سے مانگنے کے بعد آدمی کو اپنی جگہ جامد و خاموش نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے حصول کے لیے پوری مستعدی سے کوشاں ہونا چاہیے انکے نزدیک دعا کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ اسی کلیہ کے تحت اقبال نے "بچے کی دعا"[2] بھی لکھی ہے جس میں "غریبوں کی حمایت"، "دردمندوں سے محبت" اور "وطن کی زینت" کا ولولہ نصیب کرنے کی التجی کی گئی ہے۔ اقبال جن کا نفس آہ میں مستور اور سینہ سوزاں فریاد سے معمور ہے، بعض جگہ سوئی ہوئی قوم کی بے حسی اور جمود سے پریشان ہو کر دنیا کی انجمن سے الگ تھلگ فاطر السمٰوٰت والارض کی محفل فطرت میں جانشینی کی آرزو رکھتے ہیں۔ جہاں نہ دنیا کے رنج و غم کا کانٹا دل میں رہے نہ شورشِ افکار

[1] مولوی وحید الدین سلیم (مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)، افکار سلیم: پانی پت ۱۹۳۸ء ص ۱۰۴

[2] علامہ اقبال: بانگ درا۔ دہلی ص ۲۵۔

و آلام۔ وہ قوم کے بے محل و بے موقع "ذوق گویائی" سے پیدا شدہ پراگندہ و شوریدہ تر ماحول سے ہٹ کر پُر سکوت جگہ کے متلاشی ہیں جہاں دیر و حرم سے اٹھنے والی ناقوس و اذان کی آواز کا بار احساں کانوں کو نہ اٹھانا پڑے اس لیے بارگاہِ ایزدی میں وہ اپنی آرزو کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم　　امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے انکو کٹیا مری دکھا دے　　جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے　　رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے　　بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے[1]

بانگ درا کی درج ذیل دعا دیکھئے آج کے حالات پر کتنی صادق آتی ہے۔

یارب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے　　جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا　　امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے[2]

موجودہ دور میں مسلم "خوابیدہ" ہی نہیں، بے حسی اور تعطل کا بھی شکار ہے، جمود کی اس کیفیت نے متاع دین و ملت کے لٹ جانے کا غم اس کے دل سے نہ صرف یہ کہ چھین لیا ہے بلکہ "احساس زیاں" سے بھی اسے محروم کر دیا ہے۔ افراد کی ایسی حالت ہی قوم کے ناکارہ اور ذلیل ہو جانے کی دلیل ہے۔ اس لیے اقبال التجا کرتے ہیں ؎

پیدا دلِ ویراں میں، پھر شورشِ محشر کر　　اس محمل خالی کو پھر شاہد لیلےٰ دے[3]

"بانگ درا" میں اقبال کا مناجاتی اسلوب بڑا ہی متلون دکھائی دیتا ہے۔ کبھی تو

[1] علامہ اقبال: "بانگ درا" (ایک آرزو) دہلی ص ۳۶ [2] ، [3] بانگ درا ص ۱۶۰۔

وہ مناجات میں شکایات کے دفتر کھول دیتے ہیں اور آہ و زاری کی جگہ زور و شکوہ سے کام لیتے ہیں کبھی اولیائے عظام کے آستانے پر کھڑے ہو کر ان سے ہی التجا کرتے ہیں کبھی حضور رسالت مآب میں اپنا دکھڑا سناتے ہیں۔ دعاؤں میں اقبال کی یہ متلون مزاجی "آداب دعا" کے منافی ہے۔ اس کے علی الرغم "بال جبریل" کی دعاؤں سے اقبال نے "حریم ذات میں شور" اور "بتکدۂ صفات" میں "غلغلہ ہائے الاماں" بلند کر دیا ہے۔ اقبال کی آہ و فغاں سے پُر دعا کی زود اثری سے "کعبہ و سومنات" میں رستخیزی کا بازار گرم ہو گیا ہے۔ لیکن اقبال اسی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ بارگاہِ ایزدی میں "گیسوے تابدار کو اور بھی تابدار کرنے" کی درخواست کرتے ہیں۔ خدائے ذوالجلال کے آگے اپنی بے حیثیتی کا اقرار کرتے ہوئے اقبال یوں دعا گو ہوتے ہیں۔

تو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو — یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو — میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر[1]

اقبال ہمیشہ عمل پیہم اور جہد مسلسل کے طرف دار رہے ہیں۔ خانقاہی نظام میں "اللہ ہو" کے ورد سے "نان جویں" تو خدا کی طرف سے حاصل ہو جائے گی، لیکن عمل پیہم کے لیے بازوے حیدرؓ بھی مومن کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے وہ در اللہ پر دعا کرتے ہیں۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر — حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے — اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر[2]

۱؎ علامہ اقبال: "بال جبریل" دہلی ص ۴ ۲؎ ایضاً ص ۶۔

اقبال بارگاہِ قدس میں بندے کے تقاضائے بیجا کی حرمت کے قائل ہیں۔ کیونکہ اس طرح کی ضد تو صرف پیغمبروں کو روا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کی ضد "ارنی" کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی ضد قوم لوط کے لیے (یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ) (سورۂ ہود ۷۴)، عام لوگ چونکہ پیغمبرانہ شان نہیں رکھتے اس لیے در اللہ پہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی خلافِ بندگی ٹھہرے گی۔ البتہ بندے کی عبدیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ آستانۂ اللہ کو نہ چھوڑے۔ اس کے در کی جبہہ سائی ہی بندے کو مستغنی کر سکتی ہے۔ مسجد قرطبہ میں اقبال نے جو دعا مانگی تھی اس میں ان تمام چیزوں کا اعتراف ہے۔ کہتے ہیں۔

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر — میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ — تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں، شہر ہے ویراں تمام — تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو[1]

اقبال نے چند تاریخی مناجاتیں بھی نظم کی ہیں۔ اسلامی جغرافیہ میں اندلس تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اندلس مسلمانوں کے قبضہ میں ۷۱۱ء میں آگیا تھا۔ بنوامیہ کے خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کے عہد حکومت (۹۱۲ء تا ۹۶۱ء) میں اندلس کی شان و شوکت انتہائی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس بلندی کا راز مسلمانوں کی سرفروشی کی تمنا، طارقؒ کی سالاری اور ان کے تعلق باللہ میں مضمر تھا۔ میدان جنگ میں طارقؒ اپنے سپاہیوں کو لے کر پہنچتے ہیں تو صف بندی کے بعد خدا سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں ؎

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ "لاتذر" میں

۱؎ علامہ اقبال: بال جبریل دہلی: دعا (مسجد قرطبہ میں) ص ۷۱۔

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے [1]

زور جنوں میں اپنی آشفتہ سری سے مسلمانوں کا دکھڑا رونے والے اقبالؔ بارگاہ ایزدی میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتے۔ آستانۂ الٰہ پہ جب بھی دعا کے لیے ان کے ہاتھ اٹھتے ہیں تو زبان پر قوم مسلم کی زبوں حالی، بے کسی اور بے بسی آجاتی ہے اور وہ نہایت تضرع کی حالت میں کہہ اٹھتے ہیں ؎

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد [2]

لیکن یہی اقبالؔ جب شکوہ پہ اتر آتے ہیں تو کہتے ہیں۔

یارب! یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کے مانند [3]

اپنے شکوہ پہ اقبالؔ نادم ہوتے ہیں تو خود ہی کہتے ہیں۔

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند [4]

صوفی شعرا میں حضرت امجدؔ حیدر آبادی، بے نظیرؔ وارثی اور صفیؔ اورنگ آبادی کا مرتبہ بلند ہے۔ امجدؔ کی رباعیات تو کلی طور پر تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بے نظیرؔ کی مثنویوں میں اقبال کا لب و لہجہ پایا جاتا ہے۔ صفیؔ کو تصوف کی تعلیمات نے صابر و شاکر اور متوکل بنا دیا تھا۔ ان کے دیوان "پراگندہ" میں توکل کے حامل اشعار کثیر تعداد میں ہیں۔ ذات اقدس پر ان کا یقین اور اعتماد اس درجہ ہے کہ وہ ہر عمل میں اسی سے استعانت و اعانت کے طالب رہتے ہیں۔

۱؎ علامہ اقبالؔ: بال جبریل دہلی: دعا .... (طارق کی دعا) ص ۸۲ ۲؎ ایضاً ص ۱۴
۳؎ ایضاً ص ۱۳ ۴؎ ایضاً ص ۱۳۔

اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے
غافل ہزار کام کا یہ ایک نام ہے [1]

وہ خود بھی خلاق اکبر کی بارگاہ میں یوں دعا گو ہیں۔

تو وہ ہے جو ہر ایک کی بگڑی سنوار دے
میری مراد بھی مرے پروردگار دے

کونین میں ذلیل نہ کر سب کے روبرو
ایمان و عیش و دولت و عزّ و وقار دے

تیرا یہ حکم مانگ ہر اک چیز مجھ سے مانگ
میری دعا کہ دے مرے پروردگار دے [2]

حفیظؔ جالندھری (م ۱۹۸۱ء) نے ایک طرف عظمت اللہ خاں کے بحور و قوافی کو اپنایا ہے تو دوسری طرف علامہ اقبالؔ کے اسلامی افکار کو قبول کیا ہے انکے شاہنامہ اسلام "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" وغیرہ میں اسلامی افکار و اقدار کی فراوانی ہے۔ ایمان کی چاشنی نے ان کی عقیدت مندانہ شاعری میں نکھار پیدا کر دیا ہے۔ خدا کا یقین، اس کی معبودیت کا اقرار اور اس کی ذات یکتا سے والہانہ محبت ان سارے مومنانہ جذبات کا سرچشمہ حفیظؔ کا ایمانی قلب رہا ہے، جس میں روحانیت کے سوتے بھی آکر ملتے ہیں اور عقل و فکر کی موجیں بھی اٹھتی ہیں۔ حفیظؔ کے یہاں بھی صفیؔ کا سا توکل ہے۔

کشتی خدا پہ چھوڑ کے بیٹھا ہوں مطمئن
دریا میں پھینک دوں نہ کہیں ناخدا کو میں [3]

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ حفیظؔ بھی اس کلیہ کے تحت خدا کو مصیبت کے وقت یاد کر لیتے ہیں ؎

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظؔ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں [4]

۱؎ صفیؔ اورنگ آبادی: "پراگندہ": حیدر آباد ۱۹۷۵ء ص ۱۰۶ ۲؎ ایضاً ص ۱۸ ۳؎ حفیظؔ جالندھری "سوز و ساز" لاہور ص ۲۳۴ ۴؎ ایضاً ص ۲۳۱۔

طوفان میں گھری ہوئی کشتی میں اسی عادت کے مطابق وہ خدا کو یوں یاد کرتے ہیں

اے نوحؑ کے کھویا لگ جائے پار نیّا
بندوں کا تو خدا ہے اور تو ہی نا خدا ہے
تیرا ہی آسرا ہے[۱]

حامد اللہ افسر میرٹھی کی شاعری میں حفیظ کا رنگ غالب ہے۔ "رموز توحید" کے کاشف، افسر بارگاہِ وحدہٗ لاشریک میں "عرض نیاز" کرتے ہیں تو اللہ کی بڑائی اور اپنی عاجزی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں تاکہ بندۂ گستاخ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکلے جو شانِ کریمی میں پکڑ کا موجب بن جائے۔

تا بکے چشمک زنی اے برقِ حسنِ بے نیاز یا تو اک دم پھونک دے یا نور سے بھر دے مجھے
میں ترے گھر آؤں جس در سے نہیں اسکی طلب تو مرے گھر آئے جس در سے وہی در دے مجھے
ہے اگر کچھ رحمتوں کے صرف بیجا کا خیال اپنی اس دنیا کو تو جنت بنا کر دے مجھے[۲]

آگے جدید مناجاتی شاعری پر بحث و گفتگو کر کے اس میں سماجی مسائل و عناصر کی نشاندہی کی کوشش کی جائے گی۔

علامہ اقبالؔ کے بعد کارل مارکس کے نظریات کے زیر اثر اردو شاعری میں زندگی کی شدتوں اور تلخیوں کا ذکر اور سماج کے ابتر حالات و مسائل کا چرچا بہت نمایاں نظر آتا ہے، ترقی پسند شعرا کے یہاں یہ اثر زیادہ دکھائی دیتا ہے ان کے بعد کے شعرا نے روایات کے بند کاٹ کر اردو شاعری کے سیل تند تیز کو

[۱] حفیظ جالندھری: "نغمہ زار" (طوفانی کشتی) لاہور ص ۹۱ [۲] افسر میرٹھی (مرتبہ ذکی کاکوری)

* نظم انسائیکلوپیڈیا" دہلی، ۱۹۷۰ء ص ۲۳۰-۲۳۱۔

"جدیدیت" کی آب جو سے ملانے کی کوشش کی ہے، بعض ترقی پسند شعرا بھی ان کے ہم نوا بن گئے۔ اس طرح اردو شاعری میں جدیدیت کا قافلہ اپنی نا معلوم منزل کی طرف "بے مقصد" بڑھتا رہا اور آج بھی وہ محو خرام ہے۔

جدیدیت کے اس قافلہ کی ابتدائی منزل میں سیاسی و اجتماعی زندگی کے مسائل کا اظہار شاعری میں حرام قرار دیا گیا تھا لیکن بدلتے حالات کے تقاضوں کی وجہ سے پہلے انہیں ممنوعات اور پھر مکروہات کے درجہ میں رکھا گیا ہے اور اب تو کراہت بھی جاتی رہی اور انہیں مرغوبات میں شمار کیا جانے لگا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ آیندہ ان کو حلال اور فرض تصور کر لیا جائے۔

رنج و مسرت، تکلیف و راحت، پریشانی و شادمانی، ناکامی و کامرانی، تنگی و تونگری، فقر و فراغ، اضطرار و قرار اور سود و زیاں راہ حیات کے ناگزیر مراحل ہیں اس پر مستزاد عصر جدید کی پیچیدہ اور تشویش ناک صورت حال نے آدمی کی نفسیات اور ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے، جس کی وجہ سے تشدد پسندی بربریت، گھبراہٹ، شکست و محرومی اور یاس انگیزی جیسے Complexes آدمی کا مقدر بن گئے ہیں۔ ان تمام جھمیلوں سے آدمی جب بے بس ہو جاتا ہے تو بالآخر اعانت کے لیے خدا کو پکارتا ہے، اسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اسی کے آگے جھکتا ہے، اسی کے قدموں پر اپنا سر ٹیکتا ہے۔ اس طرح کی آہ و زاری میں بندہ کبھی اپنے عجز کا اقرار اور خود سپردگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی فروتنی کا دکھڑا سنانے لگتا ہے اور کبھی سماجی مسائل و اجتماعی معاملات کا رونا روتا ہے۔ وہ انسانیت کو درندگی کے مقابلے میں پامال اور صدق و خیر کو کذب و شر کے

بالمقابل پسپا دیکھتا ہے تو بے چین ہو جاتا ہے اور جب اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں پست و کم قوت سمجھتا ہے تو بارگاہِ ایزدی میں گریاں کناں ہوتا ہے۔ اس طرح کی آہ و زاری اصطلاحاً "مناجات" کہلاتی ہے۔ عصری مناجاتی شاعری میں انابت و رجوع الی اللہ کی کیفیات کی فراوانی ہے۔

جدید مناجاتی شاعری میں سماجی زندگی کے احساس کے تین ابعاد دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جدید شعرا اپنی مناجاتوں میں سماجی ماحول اور معاشرتی اقدار کو جوں کا توں پیش کر دیتے ہیں نہ تو سماجی مسائل کی دشواریوں سے انہیں کوئی کام اور نہ ہی ان مسائل کے سد باب کی انہیں کوئی فکر ہوتی ہے بلکہ نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں وہ اچھائیوں اور برائیوں کو بے کم و کاست بارگاہ ایزدی میں پیش کر دیتے ہیں اور اللہ سے صاف صاف کہدیتے ہیں کہ یہ تیرے بندوں کی دنیا کے احوال ہیں۔ دوسرا پہلو مناجاتی شاعری کا یہ ہے کہ اس میں سماج کی اصلاح کی فکر کی جاتی ہے، ایسے شعرا سماجی اصلاح کے متمنی ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ اس کام کے لیے مجبور و بے بس ہوتے ہیں اس لیے اللہ کی مدد و نصرت کے طالب رہتے ہیں۔ تیسری قسم ان مناجاتوں کی ہے جن میں اصلاح کے لیے انقلابی اور احتجاجی انداز بیان کو ترجیح دی گئی ہے۔ ایسی مناجاتوں میں شاعر بالآخر یہ کہدیتا ہے کہ بارِ الٰہ اس دنیا کو اجاڑ کر نئی دنیا آباد کر دے۔ اس طرح مناجات کے ان تینوں پہلوؤں میں عصر حاضر کے بڑے۔ چھوٹے سماجی مسائل کو نہایت واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مناجاتیں قاری کے دل پر ایسا تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہر پڑھنے والا اس میں پیش کیے گئے مسئلہ کو اپنی زندگی ہی کا مسئلہ سمجھنے لگتا ہے۔

گویا کائناتی مسائل ذاتی بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس طرح شعرائے جدید نے مناجاتیں لکھ کر اپنے باایمان ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور سماج کی صحیح و حقیقی تصویر اپنی مناجاتوں میں بیان کر کے بارگاہِ رب العزت میں پیش کر دی ہے، اس سے سماج سے ان کے تعلق اور اسکی پُر آشوب حالت پر ان کے ذہنی کرب کا اندازہ ہوتا ہے اس نوع کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں فسادات کا مسئلہ درد لا علاج بن گیا ہے۔ مفاد پرست عناصر مذہب کے نام پر سادہ لوح لوگوں کو گمراہ کرتے اور ان کو آپس میں لڑا کر ان کی جانیں ضایع کراتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وحشت و بربریت اور خوف و دہشت کی فضا ہر وقت چھائی رہتی ہے۔ عمیق حنفی کو سماج کے اس کرب نے بستر مرگ پر بھی ستایا ہے۔ ان کی بے چینی جب شدت اختیار کر لیتی ہے تو وہ بارگاہِ ایزدی میں یوں التجا کرتے ہیں۔

بھلا یہ بھی کیا بات ہے۔

....

ترے نام کے کتنے ہجے بتاتے ہیں لوگ
کہ تو لامکاں لازماں بیکراں ہے
مگر تجھ کو شبدوں کے اندر دھنساتے ہیں لوگ
ترے نام پر بھائیوں کے لہو میں نہلاتے ہیں لوگ
مگر وہ نہیں تو، جو تجھ کو بتاتے ہیں لوگ
مجھے نام۔ گن، چھب نہیں
صرف پہچان دے

....

مجھ کو وہ دھیان دے
جڑیں جس کی تیری حقیقت کے اندر جمی ہوں۔
(دعا: عمیق حنفی: بستر مرگ پر لکھی گئی)
وہ ایمان دے۔

مہدی پرتاپ گڑھی اپنے شہر کی گلیوں اور شاہراہوں پر مقتل سجے ہوئے اور صلیبیں گڑی ہوئی دیکھتے ہیں تو اشک سحر گاہی سے وضو کرکے "نئی سحر کی دعا" کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں (ملاحظہ ہو نئی سحر کی دعا: مہدی پرتاپ گڑھی)

ایک شاعر نے ہابیل قابیل کے واقعہ کو بطور استعارہ اپنی دعا میں استعمال کیا ہے۔ آج بھی قابیل کے اوصاف کے حامل افراد اپنے بھائیوں کا خون بہاتے ہیں۔

مناجات سے قطع نظر جدید شعرا نے اپنی دیگر منظومات میں بھی "فسادات" کے سخت ترین مسئلہ کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا ہے اور اس سے ہونے والی پامالی کی نہایت موثر منظوم تصویریں کھینچی ہیں۔

اللہ کے گھر پر غاصبانہ قبضہ کرکے اسے "ڈھانے" کے ناپاک ارادے کی وجہ سے جب اس میں سجدہ ریز ہونے والا اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے تو وہ اپنے مولیٰ و آقا اور اس گھر کے مالک کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔

مالکِ دو جہاں! خالقِ کل جہاں!! — تو ہی معبود ہے! تو ہی مسجود ہے
تیرا گھر چھن گیا، ہم نہ کچھ کر سکے — ہم ہیں بے بس سبھی، ہم ہیں بیکس سبھی
بھیج دے اے خدا! سن لے دل کی دعا — ابرہہ کے لیے غول ابابیلوں کے
(غول ابابیلوں کے: غلام محمد فیض آبادی)

اس نظم میں تلمیح کا استعمال کرکے شاعر نے جو رقت اور اثر آفرینی پیدا کی ہے وہ

لاجواب ہے۔ دل کی ایسی کسک اور سانس کی ایسی گھٹن ہی انسان کو اللہ کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اسی لیے تو فیض احمد فیض بھی کہہ اٹھتے ہیں ؎

جو دل دکھا ہے بہت زیادہ — تجھے پکارا ہے بے ارادہ
(شام شہر یاراں)

لیکن یہ دکھا دل بندہ جب اللہ کی مدد ونصرت کے انتظار کی تاب نہیں لاتا تو ناامید ہو جاتا ہے اور یاس کے جال میں پھنس کر "نقش فریادی" بن جاتا ہے۔

بند ہیں مدتوں سے بابِ قبول — ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بے نیاز دعا ہے رب کریم
(نقش فریادی)

دوسرا بڑا مسئلہ غربت اور افلاس کا ہے۔ اس کی شدت بین الاقوامی سطح پر محسوس کی جارہی ہے۔ دنیا کی کم از کم تین چوتھائی آبادی افلاس و ناداری کے آزار میں تڑپ رہی ہے، جدید شعرا سے یہ صورت حال مخفی نہیں، چنانچہ محمد علوی بارگاہِ ایزدی میں اپنی معصوم تمنا کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

نئے نئے کپڑوں کی بو سے سارا گھر بھر جائے — ایسا ہو بچوں کے بدن پر میل نظر نہ آئے
اب کے عید کا دن آئے تو دودھ سوئیاں کھائے
(دعا: محمد علوی)

اس مختصر سی دعا میں اگرچہ شاعر کا اپنا کرب وافلاس عیاں ہے لیکن دنیا کے سارے مفلوک الحال لوگوں کی معصوم تمنائیں اور موہوم خواہشات اس میں مضمر ہیں۔ وحید اختر کی مناجات "آگہی کی دعا" میں بھی مفلسوں کے لیے گریہ وزاری کی گئی ہے۔

جدیدیت مذہب بیزاری ہی نہیں ہے، بلکہ وہ مذہب کو جامد رسوم سے آزاد کرنے اور اس کی صحیح روح کو آشکارا کرنے کی کوشش سے بھی عبارت ہے۔

ن م۔ راشد جیسا خدا بیزار شاعر بھی بالآخر "انسان" کے دکھ درد کا شکوہ ذاتِ باری ہی میں کرتا ہے۔

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں جاہلوں مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے

یہ دنیا بیکسوں اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں

ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی (انسان)

منصور اعجاز نے بارگاہ ایزدی میں رنجور انسانوں کا دکھڑا ایک اور پیرایہ میں پیش کیا ہے جو ایک نرالا انداز ہے۔

سماجی انتشار اور بدامنی کی ایک وجہ اختیارات کی غیر مساوی تقسیم بھی رہی ہے۔ صاحبِ اقتدار زعم باطل میں اکثر و بیشتر من مانی کر کے جبر و تشدد پر اتر آتے ہیں، جس کی وجہ سے بے اثر طبقہ یا سادہ لوح لوگ ہمیشہ ناانصافی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ جدید شعرا نے اس کے حل کے لیے بھی بارگاہ رب العزت میں دعا کی ہے، فرحت احساس نہایت عاجزی سے کہہ رہے ہیں۔

تو برے لوگوں کو اتنی ڈھیل مت دے اے خدا
کوئی تیرا نام لیوا تو یہاں باقی رہے (دعا)

جدید شعرا کی اس قسم کی "بے چینی" انفرادی نہیں ہے بلکہ اس میں اجتماعی پہلو بھی نمایاں ہے۔ فرحت احساس کے یاس انگیز اور حزنیہ رجحان کے بالمقابل قتیل شفائی کا نشاطیہ اور پُر امید آہنگ بھی ملاحظہ ہو۔

آخر تِرا نہ بن بیٹھے وہ چھوٹے چھوٹے لوگوں میں
جنکو رتبہ دیا ہے تو نے ظرف بھی اسکو عالی دے (دعا)

جب حضرت نوح، لوط اور شیث علیہم السلام قوم کی بے جا حرکتوں سے تنگ آگئے تھے تو بارگاہ ایزدی میں انھوں نے اس کے حق میں بد دعا کر دی تھی، جس سے وہ

قومیں اللہ کے عذاب کی زد میں آگئیں۔ حضرت یوسفؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ پر قوم کا جبر و تشدد بڑھتا گیا تو ان پیغمبروں نے بجائے بد دعا کرنے کے اللہ سے ان کے لیے ہدایت مانگی۔ فرحت احساس اور قتیل شفائی کی دعاؤں میں یہی فرق ہے،

ہوا کا رخ دیکھ کر چلنے والے لوگوں کی منزل نہیں ہوتی۔ یہ "ابن الوقت" صرف اپنا نفع تلاش کرتے ہیں۔ ذاتی مفاد کی خاطر آئے دن نت نئے رنگ بدلتے ہیں۔ یہ منافقانہ طرز زندگی آج کل کے اکثر و بیشتر نام نہاد رہنماؤں کا شیوہ ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے انتخاب میں عموماً لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ "اچھے" کا انتخاب مشکل ترین مسئلہ بنا ہوا ہے، کیونکہ "اچھے" کی آج کوئی پہچان نہیں رہی۔ ہر آدمی شرافت کا "پوستین" اوڑھے ہوئے ہے اس مسئلہ کے حل کے لیے حامد اقبال صدیقی یوں دعا گو ہیں۔

تری زمین پہ چہرے بدلنا عام ہوا
تو مری روح پہ کوئی نشان دے اللہ
(غزل کا ایک شعر)

قول و فعل میں تفاوت و تضاد بھی ایک مسئلہ بنا ہوا ہے جو چہرے بدلنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔ قولاً "خیر" کی ترغیب دینے والے عملاً "شر" سے رغبت رکھتے ہیں۔ اسی لیے شوکت نظمی کہتے ہیں۔

قول و فعل پہ ثابت رکھ
ہر جذبہ ایمانی دے

تلخی کی جو کاٹ کرے
ایسی مجھ کو بانی دے (حمد)

لیکن اس کے برخلاف عبدالرحیم نشتر کی دعا بڑی انقلابی ہے وہ برائیوں سے نبٹنے کے لیے خدائے عز و جل سے ہمت و جرأت اور استقامت و استقلال کے خواہاں ہیں۔ ان کے ارادوں میں صلابت کا یہ عالم ہے کہ وہ تقدیر کی بنیاد پر مانع

اور سدباب بنے حصاروں کو توڑنے پھوڑنے کے لیے اللہ ہی سے قوت و طاقت کے طالب ہیں۔ وہ صاف طور پر کہتے ہیں۔

بچھایا ہے رستے میں دریا جو تو نے　　تو پھر میرے ہاتھوں میں کوئی عصا دے
اگر دل دیا ہے تو ہمت عطا کر　　نہیں تو اٹھا اپنا دیپک بجھا دے

مندرجہ بالا اشعار میں تلمیح ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لمبے چوڑے قصے کو شاعر نے دو شعروں میں بیان کر کے لطیف پیرائے میں اللہ سے یہ دعا کی ہے کہ ویسی ہی ہمت مجھے بھی عطا کر اور راہِ حیات میں مشکلات و آفات و بلیات کے بچھے ہوئے دریا سے راستہ نکالنے کے لیے ہمت و استقلال اور ہوش و دانشمندی کا عصا عطا کر۔

پینے کا پانی اپنے پاس نہ رہنے کی وجہ سے جس طرح ایک مسافر سمندر کے بیچ میں رہتے ہوئے بھی پانی کو ترستا ہے، ٹھیک اسی طرح کی کیفیت مکانوں کی کثرت والے شہروں میں بے گھروں کی ہے۔ بلراج کومل نے "سائے کے ناخن" میں اس کیفیت کی عکاسی کی ہے اور اس کے لیے پاکستان کے جدید شاعر افتخار عارف بارگاہِ ایزدی میں اس طرح فریاد کناں ہوئے ہیں۔

مرے خدا! مجھے اتنا تو معتبر کر دے　　میں جس مکان میں رہتا ہوں اسکو گھر کر دے
(مہر دو نیم)

اس دور میں عورت کی پامالی اور اس کی عفت و عصمت کو داغدار کرنے کے واقعات روزانہ ہو رہے ہیں۔ عورت کی اس مجبور زندگی میں سماج کے سارے دروازے اس کی مدد کے لیے بند دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے رعنا حیدری خدا سے ہمت و جرات کی بھیک مانگ رہی ہیں۔

عطا ہو مجھ کو وہ اثر　　کہ دل کے واہموں کو دور کر
بلا جھجھک میں جب بڑھوں　　تو اے خدا اسی گھڑی
تو حوصلوں کو بخش دے جرأتیں　　کہ پھر مجھے نہ حشر تک حاجت دعا رہے
(رعنا حیدری: دعا)

بے چین و بے کیف زندگی کی یہ کشتی دنیا کے متلاطم سمندر میں ہچکولے کھاتی ہوئی چل رہی ہے۔ ڈوبنے کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔ خوف ہر حالت میں پیچھا نہیں چھوڑتا۔ دنیا کی ایسی مایوس زندگی سے تنگ آکر بالآخر ہمارے حساس شاعر دنیا کی تباہی کے لیے بددعا کرتے ہیں۔ ظلم و استبداد کی موجیں جب زندگی کی کشتی کو ناکارہ بنانے کے لیے کوشاں دکھائی دیتی ہیں تو شکست خوردگی کے عالم میں جھنجھلاہٹ کے دباؤ سے نہایت جذباتی ہو کر شاعر کہتا ہے۔

اے مرے رب! مٹا دے تو
اس بے وفا، سنگدل اور بے انس دنیا کو
حرفِ غلط کی طرح　　(خالد شفائی: انوکھی دعا)

اور اندر سروپ ناداں پکار اٹھتے ہیں سے
دعا کرو
کہ خدا آسمان سے بھیجے / اک ایسا ہاتھ
کہ جس کا اشارہ پاتے ہی
فنا کی گود میں سو جائے یہ حریفِ بقا۔
اور اس ہجومِ ستم دیدہ کو امان ملے۔
جو نامرادیوں کی آندھیوں میں زندہ ہے۔　　(غیبی ہاتھ)

غرضکہ اردو کی جدید مناجاتی شاعری میں بھی سماجی جھلک کی کیفیت دکھائی دیتی ہے اس کے متعلق اس طرح کا منفی رجحان اگرچہ جدید شعرا کے یہاں بڑی حد تک پایا جاتا ہے اور شعرا کی یہ برگشتگی ان کے عہد کے تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی شکست کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے، لیکن مناجاتوں میں یہ منفی رجحان شعوری طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ تہذیبی و معاشرتی اقدار کی شکست سے متصادم شاعر جب اپنی زندگی میں مایوسی اور پراگندگی کو محسوس کرنے لگتا ہے تو لامحالہ وہ پھر بجائے اپنے سماج کے، اپنے دوست و اقربا کے، اپنے یار و غمخوار کے اس ماورا الورا ہستی ہی کو مدد و نصرت کے لیے پکارتا ہے،

ہندوستان کی سب سے پہلی تفسیر

کاشف الحقائق و قاموس الدقائق

از

محمد عارف اعظمی عمری

اس بارہ میں تذکرہ نگار مختلف الرائے ہیں کہ ہندوستان میں سب سے پہلے کس نے تفسیر لکھی، بعض کے خیال میں حافظ ابن تاج ملتانی متوفی بعد ۷۳۶ھ کی خلاصۃ جواہر القرآن یہاں کی سب سے پہلی تفسیری تصنیف ہے[1] بعض نے شیخ قاسم بن عمر دہلوی خواہرزادہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی "لطائف التفسیر" کو اولیت دی ہے[2] اور بعض تذکرہ نگاروں کے نزدیک نظام نیشاپوری کی تفسیر "غرائب القرآن و رغائب الفرقان" ہندوستان کی سب سے قدیم تفسیر ہے[3] راقم کے خیال میں مذکورۂ بالا تفسیروں سے بھی پہلے شیخ محمد بن احمد شریحی تھانیسری مرکلی گجراتی ثم دہلوی نے اپنی تفسیر "کاشف الحقائق و قاموس الدقائق" لکھی جو غالباً ہندوستان میں لکھی جانے والی سب سے پہلی تفسیری کتاب ہے اسکے

---

[1] زبید احمد، کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو عربک لٹریچر ص ۳۵ [2] مجلہ علوم القرآن علی گڑھ جلد ۱ شمارہ ۲ مقالہ علم قرآن عہد سلطنت کے ہندوستان میں از ڈاکٹر ظفر الاسلام

[3] اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۶ ص ۵۳۱ مادہ تفسیر۔

مصنف عہد سلطنت میں سلطان غیاث الدین بلبن کے دور کے ایک صاحب ورع ممتاز عالم اور بلند پایہ مفسر و محدث تھے، تحقیق و تلاش سے ان کے اور ان کی تفسیر کے بارہ میں جو معلومات دستیاب ہوسکی ہیں ذیل میں ان کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

نام ونسب اور خاندانی حالات مصنف کا نام محمد اور والد کا نام احمد تھا، زہد و تقویٰ کی بنا پر کمال الدین زاہد ان کا لقب ہوگیا تھا[1] سلسلۂ نسب یوں ہے محمد بن احمد بن محمد ماریکلی۔

آبائی وطن احمد آباد صوبہ گجرات کا ایک موضع مرکل تھا۔ اسی بنا پر وہ ماریکلی کہلاتے ہیں، تاہم ان کی نشو ونما دہلی میں ہوئی اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ اس سے زیادہ ان کے خاندانی حالات کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، البتہ یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں مرکل نام کی یہ بستی بڑی مردم خیز تھی اور اس کے اہم اشخاص مرکز سلطنت دہلی میں آباد تھے، مثلاً اسی دور کے ایک نامور طبیب حسام الدین مرکلی تھے جو دہلی ہی میں فردکش تھے[2] اور اس سے پہلے ایک مولانا حمید الدین ماریکلی بھی سلطان ناصر الدین محمود بن التمش کے عہد میں گذرے ہیں[3]

مولانا کمال الدین زاہد کے خاندان میں مدتوں علم و فن کا چرچا رہا، چنانچہ شیخ محمد بن احمد گجراتی معروف بہ حسن محمد میاں جیو صاحب "تفسیر محمدی" متوفی ۹۸۲ھ کا سلسلہ نسب مولانا کمال الدین زاہد ہی سے ملتا ہے[4]

تعلیم مولانا کمال الدین زاہد کو حدیث و فقہ میں زیادہ درک حاصل تھا اور

---

[1] سیر الاولیا، میر خورد ص ۱۱۵ مطبوعہ لاہور [2] نزہۃ الخواطر جلد اول ص ۱۴۴ [3] ایضاً ص ۱۴۶ [4] نزہۃ الخواطر جلد ۴ ص ۸۷۔

ان دونوں علوم کا درس انھوں نے اپنے استاد شیخ برہان الدین محمود بلخی سے لیا تھا، جو سلطان غیاث الدین بلبن ہی کے عہد کے ایک متبحر عالم اور جامع شریعت وطریقت بزرگ تھے[1]۔ ان کو فقہ میں براہِ راست امام مرغینانی صاحب ہدایہ سے شرف تلمذ حاصل تھا اور حدیث کا درس انھوں نے امام حسن بن محمد صغانی لاہوری سے لیا تھا، جو ہندوستان میں لکھے جانے والے سب سے پہلے مجموعۂ احادیث "مشارق الانوار" کے مصنف ہیں۔

درس وتدریس تذکرہ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کمال الدین زاہد نے دہلی ہی میں تعلیم پائی۔ پھر یہیں وہ ایک مسجد میں جو نجم الدین ابوبکر تلواشیؒ کے نام سے منسوب تھی، درس وتدریس میں مشغول ہوئے[2]۔ ان کے تلامذہ میں سرفہرست شیخ نظام الدین اولیاؒ تھے، جنھوں نے ان سے مشارق الانوار پڑھی اور کتاب کو حفظ کرلیا[3] مولانا کمال الدین زاہد نے اپنے قلم سے اپنے شاگرد رشید کو اس کتاب کا اجازت نامہ لکھ کر دیا جو سیر الاولیاء میں درج ہے[4]

تقویٰ اور پاکیزگی مولانا کمال الدین بڑے متقی، پرہیزگار اور خداترس عالم تھے؛ اسی کے ساتھ وہ بہت جری اور بے باک بھی تھے، ایک مرتبہ غیاث الدین بلبن نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ بادشاہ کی نماز کی امامت فرمائیں تو انھوں نے اس سے عذر کردیا اور فرمایا کہ میرے پاس نماز کے علاوہ اور کیا ہے، بادشاہ اس کو بھی برباد کرنا چاہتا ہے[5]

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد اول ص ۴۰۔۲ [2] سیر الاولیاء ص ۱۱۵ [3] نزہۃ الخواطر جلد اول ص ۲۰۴ و جلد سوم ص ۱۲۳ [4] سیر الاولیاء ص ۱۱۴۔۱۱۵ [5] ایضاً ص ۱۱۶۔

وفات صاحب نزہۃ الخواطر کے بیان کے مطابق ۷۸۴ھ میں دہلی میں ان کا انتقال ہوا[1]

تفسیر کاشف الحقائق مولانا کی اور تصانیف کا تو علم نہیں ہو سکا اس لیے صرف انکی تفسیر کے بارے میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ یہ تفسیر ہندوستان میں لکھی گئی سب سے پہلی تفسیر ہے اور یہ از اول تا آخر نہایت فصیح عربی زبان میں ہے، اس کا ایک عمدہ اور نادر مکمل نسخہ مولانا شاہ ابو الحسن زید فاروقی مجددی سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ ابو الخیر کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے، یہ نسخہ خط نسخ کی دیدہ زیب کتابت کا عمدہ نمونہ ہے اور ۱۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ میں ۲۲ سطریں ہیں، جس کی دو سطریں سرخ اور ایک نیلی ہے، چند صفحات مسطر اور بقیہ غیر مسطر ہیں، غیر مسطر صفحات کا سائز طول میں ۲۵ سینٹی میٹر اور عرض میں ۱۴½ سینٹی میٹر اور مسطر کا سائز لمبائی میں ۱۹ سینٹی میٹر اور چوڑائی میں ۹ سینٹی میٹر ہے، حاشیہ کی جگہ بالکل سادہ ہے، کاغذ قدیم کشمیری، چکنا، باریک حنائی رنگ کا ہے، اور کتابت نہایت صاف ستھری اور واضح ہے اور اس میں سیاہ چمکدار روشنائی استعمال کی گئی ہے اور جگہ جگہ شنگرفی تحریر کی لالہ کاری بھی موجود ہے، صفحات کی ترتیب بھی درست ہے، لیکن کاتب کا نام اور سن کتابت وغیرہ کہیں درج نہیں ہے[2]۔

اس تفسیر کا ایک دوسرا نامکمل نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتبخانے

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد اول ص ۲۰۴ [2] ماہنامہ برہان جلد نمبر ۷۶ شمارہ نمبر ۶ ماہ جون ۱۹۷۶ء مقالہ تفسیر کاشف الحقائق کا نادر مخطوطہ از مولانا نظام الدین صاحب کاظمی و ماہنامہ عقیدت دہلی جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱ ماہ فروری ۱۹۹۰ء مقالہ تفسیر کاشف الحقائق از مولانا نظر علی خان رام پوری۔

میں محفوظ ہے۔ جس پر نصرت جنگ کی مہر ثبت ہے اور اس میں ۷۱۳ اوراق ہیں، یہ نسخہ کئی جگہوں پر سادہ رہ گیا ہے اور کچھ جگہوں پر اس کے اوراق کی ترتیب غلط ہو گئی ہے، تاہم اس کا اختتام آخری سورہ کی تشریح پر ہوا ہے، اس اعتبار سے اس نسخہ کو یک گونہ مکمل کہا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نامکمل نسخہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے اور اس کے حواشی بھی انھوں نے ہی تحریر کیے ہیں۔ مگر تفسیر کے اس مکمل نسخہ کو دیکھنے کے بعد جو شاہ ابو الحسن زید کی ملکیت میں ہے یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا بلکہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا غیر مرتب اور ناقص نسخہ ہے، اس نسخہ میں بھی کاتب کا نام اور سن کتابت وغیرہ موجود نہیں ہے۔

خصوصیات ۱۔ اس تفسیر کی بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں ایک ہندی نژاد مصنف کی یہ سب سے پہلی مکمل تفسیر ہے، اس کے مصنف امام بیضاویؒ کے معاصر ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ تفسیر بیضاوی کی طرح اس میں بھی ابتدا میں تفصیلی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ یہ انداز مختصر ہوتا گیا ہے۔

۲۔ اس کی زبان بہت سلیس اور سہل ہے اور اس سے قرآنی آیات کے مطالب کے علاوہ خود مولف کے نقطۂ نظر کی بھی بخوبی وضاحت ہوتی ہے، عبارت میں عربی اصول و قواعد کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، ذیل میں اس تفسیر کا خطبۂ حمد و صلوٰۃ درج کیا جاتا ہے جس سے مولف کی عربی زبان سے اچھی واقفیت اور تفسیر کے اصول و مناہج پر بھی خاص روشنی پڑتی ہے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین الذی تمام تعریف اللہ رب العالمین کیلئے ہے

انزل علی حبیبه القرآن وجعله	جس نے اپنے حبیب پر قرآن نازل
هادیا الی دقائق لاهل العرفان	فرمایا اور اس کو اہل عرفان کے لیے
واودع فیه لطائف اسراره	اسرار ورموز کی واقفیت کا رہبر
لم یطلع علیها الامن کان	بنایا اور اس میں ایسے لطیف اسرار
جدیرا العتبة داره وتقدس	سمودیے جن کی بافت اسی کو ہو سکتی
ذاته وصفاته عن الکون والفساد	ہے جو اس کے در کا اہل ہو۔ اس کی
وتنزه وجوده عما یصفه	ذات وصفات کون وفساد سے
اهل الحلول والاتحاد وتفرد	پاک، اس کا وجود اہل حلول و
بوحدانیته عن الاماکن والاکوام	اتحاد کے نظریاتی خیالات سے منزہ
وتوحد لجلاله عن المشابهة	اس کی وحدانیت کون ومکان سے
والحدثان والصلوة والسلام	بے نیاز اور اس کا جاہ وجلال مشابہت
علی رسوله محمد خیر الانام	اور فنا سے بے داغ ہے اور صلوۃ
وآله واصحابه هداة الاسلام	وسلام ہو اللہ کے رسول حضرت
جعله بین سائر المظاهر	محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سارے
مظهرا جامعا وکالشمس بین	انسانوں میں برتر اور افضل ہیں اور
الکواکب لامعا، اما بعد فیقول	ان کے آل واصحاب پر جو اسلام کے
اضعف عباد الله المجید محمد بن	ہادی ورہبر ہیں، اللہ رب العزت نے
احمد بن محمد الشریحی الکندی	آپ کو سارے مظاہر کا ایک مظہر
ثم التهانیسری ثم الکجراتی	جامع اور کواکب کے درمیان ایک

اصلح الله شانه وصانه عما	چمکتا سورج بنایا، اس کے بعد اللہ
شانه وغفر له ولوالدیه	کا ناتواں بندہ محمد بن احمد بن محمد
وانعم علیهما وعلیه بما لدیه[1]	الشریحی کندی ثم تھانیسری گجراتی
	عرض کرتا ہے، اللہ تعالی اس کا حال
	درست رکھے اور اس میں استقامت
	بخشے اور اس کی اور اس کے والدین
	کی مغفرت فرمائے اور اپنے انعامات
	سے ہم تمام کو نوازے۔

۳- یہ تفسیر جس زمانہ میں لکھی گئی ہے اس وقت ہندوستان میں تصوف کا بڑا اثر تھا اور خود مصنف بھی صوفیا ہی کے زمرہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے اس میں بھی تصوف کے اثر کی کارفرمائی ہے بلکہ یہ دراصل اسی مکتب فکر کی تشریح وتوضیح کے جذبہ سے لکھی گئی ہے، چنانچہ اس خصوصیت کا ذکر خود مصنف کے لفظوں میں ملاحظہ ہو

لما کانت اکثر التفاسیر	اکثر تفسیروں میں عربی قواعد اور
مملوءة بفوائد العربیة	امور شریعت تو کثرت سے بیان
والشریعة ولم یکن تفسیر	کیے گئے ہیں مگر کوئی تفسیر ایسی موجود
حاویا لدقائق الطریقة	نہ تھی جو سلاست بیان اور دلپذیری
والحقیقة بحیث یکون	کے ساتھ طریقت وحقیقت کے
احسن تحریرا واصلح تقریرا	نکات پر مشتمل ہو اس لیے میں نے

[1] مخطوطہ شاہ ابوالحسن زید فاروقی بحوالہ مقالہ تفسیر کاشف الحقائق کا نادر مخطوطہ۔

اردت ان اکتب تفسیرا	ایک ایسی مختصر تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا
موجزا شاملا لاسرار الالٰہیات	جو الٰہیات کے اسرار و رموز پر
کاشفا لمعانی القرآن من التوفیقات	مشتمل اور قرآنی حقائق کو ظاہر
ھادیا الی طریق الرشاد	کرنے والی ہو نیز یہ کتاب رشد
موصلا الی سبیل السداد[1]	و ہدایت کو عام کرنے والی اور
	راہ راست کی راہ بر بن سکے۔

ماخذ اس تفسیر میں ابن عطا اور حسن بصری کے اقوال اور علامہ دینوری، امام قشیری، مولانا جلال الدین رومی، شمس تبریزی اور شیخ سعدی وغیرہ کی کتابوں کے حوالے بکثرت ملتے ہیں، مصنف نے قدیم تفسیروں کو پیش نظر رکھنے کے علاوہ خود بھی جا بجا لطیف نکتے بیان کیے ہیں، جیسا کہ وہ مقدمہ میں لکھتے ہیں:

واخذت من بعض التفاسیر	میں نے بعض تفسیروں کی عبارتیں
بعین کلام المنقول وقلت	بعینہ نقل کر دی ہیں اور اکثر مقامات
فی اکثر مواضع لطائف منی	پر اپنے ذاتی نکات بھی بیان کیے
لم یطلع علیھا ذوی العقول[2]	ہیں جن کا اہل دانش کو پتہ نہ تھا

ایک غلط فہمی کا ازالہ بعض تذکرہ نگاروں نے تفسیر کاشف الحقائق اور تفسیر محمدی مصنفہ محمد بن احمد بن نصیر میاں جیو کو ایک ہی تصنیف قرار دیا ہے[3]، جو غلط ہے پہلے

[1] مخطوطہ شاہ ابوالحسن زید فاروقی بحوالہ مقالہ تفسیر کاشف الحقائق کا نادر مخطوطہ [2] مخطوطہ شاہ ابوالحسن زید فاروقی [3] کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو عربک لٹریچر از زبید احمد ص ۱۱۶ اور ۲۳۶۔

معارف جولائی ۶۹ء مقالہ ہندوستان میں علوم قرآنی کا نشوونما از پروفیسر خلیق احمد نظامی اور تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند ج ۳ ص ۲۲۱ مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس۔

گذر چکا ہے کہ شیخ میاں جیو مولانا کمال الدین زاہد کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں بزرگوں نے علیحدہ علیحدہ تفسیریں لکھی ہیں، ہندوستان میں علم تفسیر اور ہندوستانی مفسرین کے موضوع پر ڈاکٹر محمد سالم قدوائی استاذ شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جو تحقیقی کام کیا ہے اس میں اس مغالطہ کو تو رفع کیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کاشف الحقائق کا مصنف شیخ احمد تھانیسری[1] (م ۸۲۰ھ) کو قرار دے کر ایک اور بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بلا شبہ شیخ تھانیسری اپنے عہد کے بڑے باکمال بزرگ اور شیخ نصیر الدین اودھی کے مرید و خلیفہ تھے مگر تذکروں میں ان کی کسی تفسیر کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

پہلی مرتبہ مولانا نظر علی خاں رام پوری نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا اور یہ ثابت کیا کہ کاشف الحقائق کے مصنف محمد بن احمد الشریحی الکندی ثم التھانیسری الگجراتی الماریکلی ثم الدہلوی الملقب بکمال الدین زاہد ہیں[2] جو راقم کے خیال میں ہندوستان کے سب سے پہلے صاحب تصنیف مفسر ہیں۔

[1] معارف شمارہ نمبر ۲ جلد نمبر ۹۷، ۱۹۶۶ء مقالہ تفسیر محمدی از محمد سالم قدوائی [2] ماہنامہ عقیدت ماہ فروری ۹۰ء

جمع و تدوین قرآن (مولفہ جناب صدیق حسن مرحوم)

قرآن مجید کے جمع و تدوین کی تاریخ پر ایک محققانہ بحث جس میں نقلی اور عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد بابرکت ہی میں مدون اور مکمل ہو گیا تھا۔

قیمت: ۱۵ روپے۔

"منیجر"

کچھ اُسامہ بن منقذ کے بارے میں

از

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

گذشتہ ستمبر سے معارف یہاں نہیں پہنچا۔ چنانچہ اس عرصہ میں جو مضامین معارف میں شایع ہوتے رہے ان سے بروقت مستفید نہ ہو سکا۔ رمضان المبارک میں ایک ماہ کے لیے جب وطن گیا تو ستمبر ۱۹۹۰ء سے مارچ ۱۹۹۱ء تک کے شماروں پر ایک نظر ڈالنے کا موقع ملا۔

اسامہ بن منقذ پر استاذ مکرم جناب پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کے دونوں مقالات خاص طور پر ذوق و شوق سے پڑھے۔ ڈاکٹر صاحب کا پہلا مضمون "اسامہ بن منقذ کی کتاب الاعتبار اور دوسری تصانیف" دسمبر ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں اور دوسرا "اسامہ بن منقذ کے حالات کا ایک اہم ماخذ علامہ مقریزی کی کتاب المقفی الکبیر" جنوری ۱۹۹۱ء کے شمارہ میں شایع ہوا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اسامہ کی شخصیت ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ کا خاص موضوع رہی ہے، لیکن سہو و نسیان سے کوئی شخص محفوظ نہیں کہ انسانی فطرت کا لازمہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے پہلے مضمون میں دو باتیں ایسی نظر آئیں جن میں ان کے حافظہ سے چوک ہو گئی ہے، ایک تو لباب الآداب کے بارے میں دوسرے اسامہ کی ایک

گمشدہ کتاب کے انکشاف کے سلسلہ میں، یہ دوسری غلطی زیادہ اہم ہے اس لیے کہ اس سے اسامہ کی تصنیفات کے بارے میں ایک غلط اطلاع فراہم ہوتی ہے چنانچہ اس کی تصحیح ضروری ہے مجھے یقین ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب کو اس تصحیح سے خوشی ہوگی کیونکہ درحقیقت یہ ان کے مضمون ہی کی خدمت ہے۔

(۱) ڈاکٹر صاحب نے اس انکشاف کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ناظرین معارف کے لیے یہ خبر باعث دلچسپی ہوگی کہ اسامہ کی ایک گمشدہ تصنیف "التاریخ البدری" کا ایک نسخہ چند ماہ پہلے دریافت ہو گیا ہے۔ اس کی اطلاع مجھے ابھی ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ جولائی ۱۹۹۰ء میں مکہ مکرمہ میں محمد عزیر شمس صاحب سے ملی، مجمع البحوث الاسلامیہ اسلام آباد کے کتب خانے میں منتشر اور پراگندہ اوراق کا ایک مجموعہ تھا، ناقص الطرفین ہونے کی وجہ سے نہ نام کتاب کا معلوم ہو سکا تھا نہ مصنف کا، لیکن حسن اتفاق سے اس میں مصنف نے اپنی بعض کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور یہ کتابیں اسامہ بن منقذ کی ہیں، اس طرح معلوم ہو سکا کہ یہ اسامہ کی کوئی تصنیف ہے، پھر چونکہ اس کتاب میں شہدائے بدر کا ذکر ہے، اس لیے یہ یقین ہو گیا کہ یہ اسامہ بن منقذ کی التاریخ البدری ہے، یہ کتاب اب تک اس کی بعض دوسری کتابوں کی طرح مفقود سمجھی جاتی تھی، محمد عزیر شمس صاحب جنھوں نے اس کتاب کا انکشاف کیا ہے اس پر ایک ایک تعاونی مضمون شائع کرنے والے ہیں۔" (معارف دسمبر ص ۴۶۸ - ۴۶۹)

حقیقت یہ ہے کہ اسامہ کی جس گمشدہ تصنیف کے نسخہ کا انکشاف ہوا ہے وہ

"التاریخ البدری" نہیں بلکہ "اخبار النساء" ہے، اہل علم کو اس ناقص اور مجہول نسخہ کی اطلاع ڈاکٹر احمد خاں (ریڈر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد) نے دی، موصوف نے مخطوطہ کے ابواب و فصول کے عناوین مجلہ مجمع اللغۃ العربیۃ بدمشق (جلد ۶۳، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۸۸ء ص ۷۳۳-۷۳۷) میں شایع کیے اور اہل علم سے درخواست کی کہ اس کتاب کے نام اور اس کے مولف کے بارے میں ان کی رہنمائی کریں۔

ڈاکٹر احمد خاں صاحب کے استفسار کے جواب میں برادرم محمد عزیر شمس صاحب کا مضمون جس کی جانب ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے اشارہ کیا ہے دمشق ہی کے مذکورہ مجلہ کے اپریل ۱۹۹۰ء کے شمارہ (جلد ۶۵ شمارہ ۲ ص ۳۳۴-۳۴۲) میں چھپ چکا ہے۔

محمد عزیر شمس صاحب نے لکھا ہے کہ اسلام آباد میں ڈاکٹر احمد خاں صاحب نے انھیں یہ مخطوطہ دکھایا، ورق گردانی کے دوران انھیں ایک جگہ مصنف کی ایک اور کتاب "التاریخ البدری" کا حوالہ نظر آیا۔ ایک اور مقام پر ایک شخص کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مصنف سے اس کی ملاقات "شیزر" میں ہوئی تھی "التاریخ البدری" اور "شیزر" کے یہی حوالے کتاب کے مولف اور اس کے نام کا پتہ لگانے کے لیے کلید ثابت ہوئے، "التاریخ البدری" کا ذکر ذہبی اور مقریزی نے اسامہ کی تصنیفات میں کیا ہے۔ خود اسامہ نے "مختصر مناقب عمر بن الخطابؓ" کے مقدمہ میں اپنی اس کتاب کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس طرح مصنف کا تعین ہو گیا۔ اب کتاب کے نام کی تلاش ہوئی، کتاب کا موضوع تو واضح تھا اس لیے کہ سارے ابواب اور فصول کا تعلق عورتوں سے ہے، ابن منقذ کی تصنیفات میں اس موضوع

پر ایک ہی کتاب "اخبار النساء" کا نام ملتا ہے۔ کتاب العصا میں ابن منقذ نے جگہ جگہ اس کتاب کے حوالے دیئے ہیں۔ پھر مقریزی نے اس کتاب کے موضوع، ترتیب اور اس کے نہج کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مکمل طور سے اس ناقص مخطوطہ پر صادق آتا ہے، اس طرح یہ بات بھی قطعی طور پر طے ہو گئی کہ یہ مخطوطہ ابن منقذ کی کتاب اخبار النساء کا ناقص نسخہ ہے۔

اس موضوع پر ابن قیم الجوزیۃ کے نام سے جو کتاب چھپی ہے اور بعض محققین نے دعوی کیا ہے کہ وہ ابن الجوزی کی تصنیف ہے، اس کے بارے میں محمد عزیر شمس صاحب نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے وہ بھی اسامہ کی کتاب ہی کا کوئی حصہ ہو، ابن القیم اور ابن الجوزی کی جانب تو اس کی نسبت قطعاً غلط ہے، البتہ اسامہ کے سلسلہ میں کوئی یقینی بات اس وقت تک نہیں کہی جا سکتی جب تک مخطوطہ اور مطبوعہ کتاب سے مقابلہ نہ کر لیا جائے یا اصل کتاب کا کوئی مکمل نسخہ دریافت نہ ہو جائے۔

(۲) لباب الآداب کے بارے میں معارف اکتوبر ۹۰ء کے شمارہ میں شیخ نذیر حسین صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا: "امیر اسامہ بن منقذ نے عربی کے نثری ادب کا انتخاب بھی کیا تھا جو مدت ہوئی قاضی احمد محمد شاکر مرحوم کی تصحیح سے قاہرہ سے شائع ہو چکا ہے"۔ (مکتوب لاہور ص ۳۱۷)

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے اپنے مضمون میں شیخ صاحب کے بیان کو سہو قرار دیا ہے، فرماتے ہیں: "یہ انھوں نے سہواً لکھ دیا ہے، یہ عربی نظم کا بہت قیمتی انتخاب ہے جس کا نام لباب الآداب ہے"۔ (دسمبر ۹۰ء ص ۴۶۲)

لباب الآداب نہ تنہا نثری ادب کا انتخاب ہے نہ شعری ادب کا بلکہ نثر و نظم

دونوں کے منتخب نمونوں پر مشتمل ہے، کتاب میں کل سات ابواب ہیں، ہر باب کا آغاز قرآنی آیات اور احادیث نبوی سے ہوتا ہے، اس کے بعد حکماء کے اقوال، حکایات و واقعات اور آخر میں باب سے متعلق کچھ منتخب اشعار درج کیے ہیں، مصنف نے لباب الآداب میں ایک جگہ اپنی ایک اور تصنیف "التاسی والتسلی" کا ذکر کیا ہے اور اس کا نہج بھی بعینہ یہی بتایا ہے (ص ۲۹۴)

لباب الآداب میں اشعار کی تعداد کسی باب میں کم ہے کسی میں زیادہ، بعض ابواب یا ان کی بعض فصلیں اشعار سے یکسر خالی ہیں، باب الآداب کی متعدد فصلوں میں صرف قرآنی آیات اور احادیث ہیں (ص ۲۹۴-۳۱۷) اشعار کے تناسب کا ایک سرسری اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ۷۶۴ صفحات کی اس کتاب میں ایسے صفحات کی تعداد جو صرف شعری نمونوں پر مشتمل ہوں مشکل سے ..۱ تک پہنچتی ہے، جبکہ ڈھائی سو سے زیادہ صفحات ایسے ہیں جن میں ایک شعر بھی نہیں ملتا، گویا نثر کا حصہ نظم پر غالب ہے، اس پہلو سے شیخ نذیر حسین صاحب کا بیان حقیقت سے زیادہ قریب ہے، ڈاکٹر مختار الدین صاحب کو یقیناً اشتباہ ہوا۔

آگے ڈاکٹر صاحب نے لباب الآداب کی طبع اول کے بارے میں لکھا ہے: "اب یہ مطبوعہ نسخہ بھی نہیں ملتا، کمیابی کے باعث اس کا عکسی ایڈیشن شایع ہونے والا تھا"۔

ڈاکٹر صاحب کا اشارہ بظاہر جس ایڈیشن کی طرف ہے وہ اب سے چار سال قبل ۱۹۸۷ء میں محقق کے ورثہ کی اجازت سے دار الکتب السلفیہ

قاہرہ سے چھپ چکا ہے۔

اسی مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے معہد المخطوطات کے بارے میں لکھا ہے: "کئی سال پہلے بعض سیاسی حوادث و حالات کی بنا پر معہد المخطوطات کا مرکز قاہرہ سے کویت منتقل کر دیا گیا تھا، معلوم نہیں صرف دفتر منتقل ہوا تھا یا سارے مائکرو فلم بھی"۔

عرض یہ ہے کہ صرف قانونی دفتر منتقل ہوا تھا، باقی وہ بیش قیمت ذخیرہ جو برسوں کی جانفشانی سے معہد کے کتب خانہ میں جمع ہوا تھا اسے کویت لانے کی اجازت دینے سے مصری حکومت نے انکار کر دیا، چنانچہ کویت میں معہد المخطوطات نے از سر نو آشیاں بندی شروع کی اور جو مہم ایک بار سر کی جا چکی تھی معہد کے ذمہ داران اسے دوبارہ سر کرنے میں لگ گئے، مجلہ کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا، کچھ کتابیں بھی شایع ہوئیں، ادھر قاہرہ میں بھی معہد کا غیر قانونی دفتر کھلا رہا، عرب لیگ میں مصر کی واپسی کے بعد گذشتہ سال معہد کے دونوں دفتروں کے درمیان تعاون اور اشتراک کی صورتوں پر غور کیا جا رہا تھا اور بعض امور طے بھی پا گئے تھے کہ پھر اس آشیانہ پر بجلی گری اور اب تک معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر کیا گزر رہی۔

اُستاد عبداللہ کنون

معاصر مراکشی عالم، مورخ اور ادیب

جناب (شیخ) نذیر حسین صاحب

عصر حاضر کے ممتاز مراکشی مصلح، عالم، ادیب اور مورخ استاد عبداللہ کنون نے ۹ جولائی ۱۹۸۹ء کو بیاسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کی ساری زندگی تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور دعوت و تجدید میں گذری۔ وہ ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء میں فاس میں پیدا ہوئے، انھوں نے دینی اور روحانی ماحول میں پرورش پائی۔

جب مراکش پر فرانسیسی سیادت قائم ہوگئی تو ان کے والد سید عبدالصمد طنجہ (TANGIER) کے بین الاقوامی شہر میں چلے آئے۔ اس کے بعد وہ ہجرت کرکے مدینہ منورہ جانا چاہتے تھے، لیکن پہلی جنگ عظیم کے باعث وہ اپنے خاندان سمیت طنجہ ہی میں ہمیشہ کے لیے مقیم ہوگئے۔

استاد عبداللہ کنون نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور اعلیٰ تعلیم مراکش کے مشاہیر علماء سے پائی۔ بیس برس کی عمر میں وہ تعلیم و تدریس کے علاوہ اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھنے لگے۔ اس وقت سرکاری مدارس میں فرانسیسی زبان کا چلن تھا اور عربی زبان خارج از نصابِ تعلیم تھی، اس لیے استاد عبداللہ

کنون نے مسلمان بچوں اور بچیوں کی تعلیم کے لیے طنجہ اور تطوان میں آزاد مدارس کھولے، جہاں ذریعہ تعلیم عربی زبان تھی۔

۱۹۵۳ء میں فرانسیسیوں نے سلطان محمد خامس کو معزول کرکے ایک غیر مقبول شخصیت کو مراکش کے تخت پر بٹھا دیا تو سارا ملک سراپا احتجاج بن گیا۔ سلطان کی بحالی کی تحریک میں استاد عبداللہ کنون نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ جب سلطان محمد خامس مراکش کے تاج و تخت پر دوبارہ متمکن ہوئے تو انھوں نے عبداللہ کنون کو طنجہ کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ اس کے بعد جب طنجہ کے بین الاقوامی علاقے کا مراکش میں انضمام ہوا تو وہ سیاسی اور مالی معاملات طے کرنے کے لیے دول یورپ اور حکومت مراکش کے درمیان رابطہ آفیسر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

استاد عبداللہ کنون سیاست میں شروع سے دلچسپی رکھتے تھے۔ جب امیر عبدالکریم (ریف) نے فرانس اور اسپین کے خلاف اعلان جہاد کیا اور اسکے نتیجہ میں مراکش میں مکمل آزادی کے لیے جمعیۃ الوطنیہ قائم ہوئی تو انھوں نے اسکے قیام میں سرگرم حصہ لیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سیاست دانوں سے مخلصانہ تعلقات کے باوجود وہ اپنے مخصوص افکار و نظریات سے کبھی بھی دستبردار نہ ہو سکے۔

استاد عبداللہ کنون کی سرگرمیوں کا اصلی میدان صحافت اور تصنیف و تالیف تھا۔ وہ بیک وقت عالم، مورخ، ادیب اور صحافی تھے۔ ڈاکٹر محمد تقی الدین الہلالی نے تطوان سے ایک ماہنامہ لسان الدین کے نام سے جاری کیا۔

(۱۹۴۶) تو ہلالی صاحب کے پاکستان اور جرمنی چلے جانے کے بعد وہ آٹھ نو سال تک لسان الدین کی ادارت کرتے رہے۔ اس رسالے میں علمی، ادبی اور سیاسی مقالات ہوتے تھے اور زبان کی صحت وصفائی کے باعث علمی ودینی حلقوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا، لسان الدین کی بندش کے بعد وہ رسالۃ الانوار اور المیثاق اور رسالۃ الاحیاء میں بھی کام کرتے رہے

استاد عبداللہ کنون اندلس کی تاریخ کے علاوہ المغرب (طرابلس، تونس الجزائر اور مراکش) کی علمی، ادبی، دینی اور سیاسی تاریخ کے بڑے واقف کار اور ماہر تھے، چنانچہ ان کی تصانیف کا محور یہی موضوع ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسلام کے دفاع میں بہت سے مضامین لکھے ہیں، دشمنانِ اسلام کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور بہت سے نوادر تحقیق کے بعد شایع کیے ہیں، انھوں نے مستقل علمی کتابوں کے علاوہ بہت سے رسائل اور کتابچے بھی شایع کیے تھے جو وقتی مسائل پر لکھے گئے ہیں۔ ان کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم انکی اہم کتابوں کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ **النبوغ المغربی**: یہ المغرب کی ادبی تاریخ ہے، جس کا تیسرا ایڈیشن تین جلدوں میں ۱۹۷۴ء میں بیروت سے شایع ہوا ہے اور علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوا ہے۔ اس کا انگریزی وہسپانوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے میڈریڈ یونیورسٹی (اسپین) نے مصنف کو ڈاکٹریٹ دی ہے۔

۲۔ **ذکریات مشاہیر رجال المغرب**: المغرب کے مشاہیر علماء، ادباء، صلحاء کے حالات میں چالیس (۴۰) چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں۔

۳۔ **احادیث عن الادب المغربی الحدیث**: معہد دراسات العربیۃ العالیہ، قاہرہ میں مصنف نے موجودہ ادب المغربی پر ایک لیکچر دیا تھا (قاہرہ ۱۹۶۴ء)

۴۔ **القاضی عیاض بین العلم والادب**: فخر مغرب عربی قاضی عیاض کے حالات میں ایک کتابچہ (ریاض ۱۹۸۴ء)

۵۔ **مدخل الی تاریخ المغرب**: مغرب عربی کی تاریخ عہد اسلام سے لے کر عصر حاضر تک (تطوان ۱۹۵۸ء)

۶۔ **شرح مقصورۃ المکودی**: عبدالرحمٰن المکودی (م ۸۰۷ھ) کے مقصورہ کی لغوی اور ادبی تشریح جو مدارس عربیہ کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے۔

۷۔ **نظرۃ فی منجد الآداب والعلوم**: لبنان کے عیسائی فاضل لوئیس معلوف نے عربی لغت کو منجد کے نام سے ابجدی ترتیب سے شایع کیا تھا، جو اپنی تسہیل کی وجہ سے بیحد مقبول ہوئی ہے اور اسکے بیسیوں ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں، لیکن علمی و دینی حلقوں میں اس پر بہت سے شبہات بھی ظاہر کیے جا رہے ہیں۔ قرآن اور احادیث کے لغات کی تشریح کے لیے اس پر مطلقاً اعتماد نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ استاد عبداللہ کنون نے المنجد کی فرو گذاشتوں کی نشاندہی کی ہے اور اسماء اور اعلام اور انساب کے بیان میں اس کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے (قاہرہ ۱۹۷۳ء)

۸۔ **ادب الفقہاء**: بعض ادبی حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ اکثر علمائے دین کی کتابوں میں سلاست اور شگفتگی نہیں ہوتی اور وہ ادبی لطافت سے خالی ہوتی ہیں، اس تاثر کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ادب الفقہاء لکھی ہے،

جس میں علمائے اسلام کی جاندار تحریروں کے اقتباس پیش کیے ہیں۔

استاد عبداللہ کنون عمر بھر اسلام کا دفاع کرتے رہے اور مسلمانوں کو صحیح اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بے شمار دینی اور اصلاحی مضامین اخباروں اور رسالوں میں لکھے تھے، جو مندرجۂ ذیل عنوانات کے تحت کتابی صورت میں شایع ہو چکے ہیں:

(۱) **مفاہیم الاسلامیہ** (طبع بیروت و دار البیضاء) (۲) **اسلام رائد** (طبع رباط، ۱۹۷۸ء) (۳) **تحرکات اسلامیہ**: (مطبوعہ دار البیضاء) (۴) **علیٰ درب الاسلام** (تطوان، ۱۹۷۲ء) (۵) **شئون اسلامیہ**: (مطبوعہ دار البیضاء) (۶) **جولات فی الفکر الاسلامی** (تطوان ۱۹۸۰ء) (۷) **منطلقات اسلامیہ** (طنجہ ۱۹۸۰ء) (۸) **الاسلام اھدیٰ** (دار البیضاء ۱۹۸۴ء) (۹) **معسکر الایمان یتحدیٰ** (طنجہ ۱۴۱۰ھ)

مذکورۂ بالا کتب میں وہ حیرت سے مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ اہل یورپ اپنے الحاد اور بے دینی کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں لیکن مسلمان اسکے برعکس یورپ والوں کی ہر ادا پر مرمٹتے ہیں اور انکی ہر بات کو تصدیق اور تحقیق کے بغیر مان لیتے ہیں۔ علی درب الاسلام میں انکی مخاطب مسلم خواتین ہیں اور انکو قرآن اور اسلام کیطرف دعوت دی گئی ہے۔ بعض مضامین میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں اور انکے انسداد کا ذکر ہے۔ انھوں نے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے عربی ریڈرین بھی لکھی ہیں۔

استاد عبداللہ کنون نے مذکورہ کتابوں کے علاوہ بہت سے نوادر تحقیق اور بڑی محنت سے شایع کیے تھے، جن میں اہم ترین یہ ہیں۔

(۱) رسائل سعدیہ: مراکش میں سعدی خاندان کے سرکاری مراسلات کا مجموعہ۔

(۲) قواعد الاسلام (قاضی عیاض): یہ مختصر سا رسالہ لسان الدین میں شایع ہوا تھا۔

(۳) تلقین الولید الصغیر (عبدالحق اشبیلی): یہ رسالہ بھی لسان الدین میں چھپ کر شایع ہوا۔

(۴) شرح الاربعین الطبیہ: چالیس طبی احادیث کا مجموعہ جو علامہ عبداللطیف بغدادی نے سنن ابن ماجہ سے منتخب کی تھیں اور انکی تہذیب و ترتیب شیخ محمد بن یوسف البرزالی نے کی تھی۔

(۵) مناہل الصفاء فی اخبار الملوک والشرفاء (عبدالعزیز القشتالی)

(۶) المنتخب من شعر ابن زاکور (مطبوعہ طنجہ و قاہرہ)

(۷) دیوان ملک غرناطہ یوسف الثالث (تطوان ۱۹۵۸ء)

(۸) عجالۃ المبتدی و فضالۃ المنتہی فی النسب (چھٹی صدی کے ماہر نسب ابوبکر الحازمی کی تصنیف مطبوعہ قاہرہ ۱۹۷۳ء)

استاد عبداللہ کنون بہت اچھے شاعر بھی تھے، چنانچہ انکے کلام کے دو تین مجموعے رباط وغیرہ سے شایع ہو چکے ہیں۔ عبداللہ کنون کے تمام عالم اسلامی کے مشاہیر سے مخلصانہ تعلقات تھے اور یہ اکابر ان کو مختلف مسائل پر خطوط لکھتے رہتے تھے، چنانچہ انکے بعض تلامذہ اور مداحین ان خطوط کو کئی جلدوں میں مرتب کر رہے ہیں۔

استاد عبداللہ کنون عالم عرب کی بہت سی علمی اور ادبی مجالس کے رکن تھے جہاں انکی آراء و تجاویز کو بڑی قدر و تعظیم سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ مجمع العلمی العربی دمشق، مجمع اللغۃ قاہرہ، مجمع اللغۃ اردن کے علاوہ رابطۂ اسلامیہ، مکہ مکرمہ کے بھی سرگرم ممبر تھے۔ مصر، تونس اور مراکش کی حکومتوں نے انہیں سرکاری انعامات اور خطابات سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ جب ۹ جولائی ۱۹۸۹ء کو ان کا انتقال ہوا تو وہ سرکاری اعزاز و اکرام سے دفن کیے گئے۔

رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔

(مجلہ مجمع اللغۃ، دمشق۔)

اخبار علمیہ

جنوبی افریقہ میں اسلام کی روشنی ان مسلمانوں کے ذریعہ پھیلی جو ڈچ سامراج کے پنجۂ استبداد کے اسیر تھے، افریقہ، مدغاسکر، سیلون، ہندوستان اور ایسٹ انڈیز کے ان مسلمان مزدوروں نے سترہویں صدی میں اسلام کے پیام امن و مساوات کو عام کیا اور اب وہاں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ سے بھی زیادہ ہے ان میں تقریباً نصف تعداد ایشیائی نژاد ہیں اور بقیہ مقامی افریقی رنگ و نسل کے ہیں، علم و ادب، تعلیم و تبلیغ اور تہذیب و ثقافت میں وہ آج بھی سرگرم عمل ہیں، چنانچہ ہمارے پیش نظر ڈربن یونیورسٹی کے شعبہ مرکز تحقیقات علوم اسلامیہ کا انگریزی علمی مجلہ 'العلم' ہے، گذشتہ برس یہ بڑی تقطیع پر شایع ہوا تھا مگر اب یہ متوسط کتابی تقطیع میں ہے اور اس میں قانون و فقہ، مصلحین امت کے نظریات و مساعی، مسلم اکثریت و اقلیت کے مسائل پر مختلف ممالک کے ممتاز اہل قلم کے مضامین شامل ہیں، جنوبی افریقہ میں مسلم اقلیت پر جناب سلیمان الیسوپ ڈانگر کا مضمون معلومات افزا ہے رسالہ کے لائق مدیر جناب ڈاکٹر سید سلمان ندوی ہیں، ان کے قلم سے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ پر ایک عمدہ مضمون بھی ہے، رسالہ کا پتہ ہے، 'العلم' سنٹر آف ریسرچ ان اسلامک اسٹڈیز، یونیورسٹی آف ڈربن، ویسٹ ول (WEST VILLE) پرائیویٹ بیگ 54001 ڈربن 400 ساؤتھ افریقہ۔

ڈربن سے 'الجمعیۃ' نامی ایک انگریزی اخبار بھی موصول ہوا ہے اس کے علاوہ ٹرانسوال کی جمعیۃ العلماء کا ترجمان 'الرشید' بھی ہماری نظر سے گزرا، انگریزی زبان میں یہ دونوں رسالے عالم اسلام کی خبروں اور دینی موضوعات پر آسان اور سلیس مضامین پر مشتمل ہیں، 'الجمعیۃ' میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک تحریر پیام انسانیت کے متعلق بھی شامل ہے، ان دونوں رسالوں سے دعوت و تبلیغ سے جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کے شوق و شغف کا پتہ چلتا ہے۔

اس خبر سے بھی مسرت ہوئی کہ وہاں ایک ہندوستانی نژاد مسلمان اسمٰعیل محمد کو جج بنایا گیا ہے، جنوبی افریقہ کی عدلیہ کی تاریخ میں وہ پہلے غیر سفید فام جج ہیں، انھوں نے نسل پرستی کی مخالفت میں کئی تحریکوں میں حصہ لیا اور ملک کے کئی ذی حیثیت رہنماؤں کے مقدمات میں قانونی پیروی بھی کی۔

گذشتہ مہینہ میں امریکا کی سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اور مقبول ترین کتابوں میں 'Final exit' کو سرفہرست قرار دیا گیا ہے، ڈیرک ہمفرے کی اس کتاب میں، مزمن، ناقابل علاج اور گویا مرض الموت میں مبتلا افراد کو ابتلاء و اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے خودکشی کے متعدد طریقے بتائے گئے ہیں اور اس کے اخلاقی جواز کے فلسفیانہ دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں، کتاب کی اس درجہ مقبولیت سے مناقشوں اور مباحثوں کا دور بھی شروع ہوگیا، بعض کا خیال ہے کہ پریشان حال اور مغلوب المزاج اس کا غلط استعمال کر سکتے ہیں اور دوسروں کے قتل کے مرتکب ہو سکتے ہیں، چند لوگوں نے اسے ان طبیبوں اور ایسے پیشۂ طب کے خلاف صدائے احتجاج سے تعبیر کیا ہے جن کا شیوہ ہے کہ ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی،

اخلاقیات کے ایک نام لیوا آرتھر کیلان نے کتاب کی کثرت اشاعت کو دہشت ناک اور پریشان کن بتلاتے ہوئے کہا کہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امریکی معاشرہ میں سہل اور بے ایذا موت کی خواہش کس درجہ عام ہو چکی ہے، مصنف ڈیرک ہمفرے کے نقطۂ نظر کے مطابق ارباب کلیسا اور فلاسفہ کے مابین اخلاقی مناظروں سے اکتا کر اب یہ رجحان عام ہے کہ اپنی موت کے انتخاب پر خود انسان کا حق ہونا چاہیے اور شاید اسی لیے مصنف نے اپنی پہلی بیوی کو خودکشی کرنے میں اس لیے مدد دی تھی کہ وہ کینسر جیسے ناقابل علاج مرض میں مبتلا تھیں۔

تہذیب نو اور علم جدید کے نام پر مسلمہ اخلاقی قدروں کو پامال کرنے کی تمنا، دراصل بے سمت اور حدود وقیود سے بے نیاز معاشرہ کی اصل بیماری ہے، اسی نفسیات کا مظہر وحشت وبربریت کے علمبرداروں کا احیاء بھی ہے، چنانچہ چنگیز خاں کو قومی ہیرو کا درجہ دیے جانے کے بعد اب منگولیا میں اس کے مقبرہ کی تلاش کا عمل تیز تر کر دیا گیا ہے، اس مہم میں منگولیا اور جاپان مشترکہ طور پر سرگرم عمل ہیں، برسہا برس کی سخت اور دشوار گزار تلاش کے بعد اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ شمالی منگولیا کے دور دراز پہاڑوں کے گھنے جنگلوں میں کہیں یہ مقبرہ موجود ہے، تقریباً ۲۴۰ مربع کیلومیٹر کا یہ خطہ صدیوں سے انسانی آبادی سے ناآشنا ہے، جاپانی ماہرین نے سیارچوں اور جدید الکٹرانک پر مبنی تکنیکی آلات سے اہم سراغ حاصل کرنیکے بعد اس پورے علاقہ کی صفائی کا کام شروع کر دیا ہے، چنگیز خاں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مرنیکے بعد بھی خون آشامی میں کمی نہ آئی، ۷۶۴ برس پہلے جب وہ دریائے زرد کے قریب فرشتۂ اجل سے زیر ہوا تو اسکے وفاداروں نے اس درجہ خفیہ طریقہ سے اسکو دفنایا کہ جس ذی حیات پر اس عمل کو دیکھنے کا شبہ بھی ہوا اسکو تہہ تیغ کر دیا گیا، اسکے پوتے منگو خاں کے کفن دفن کا منظر دیکھنے والوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ بقول مارکوپولو اس جرم میں تقریباً بیس ہزار انسانوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

(ع۔ص)

آثار علمیہ وتاریخیہ

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول

پاکستان کے تمام اسلامی مکاتب فکر کے ۳۱ جید اور معتمد علمائے کرام نے اپنے اجتماع منعقدہ کراچی بتاریخ ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء زیر صدارت مفکر اسلام مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ میں مندرجہ ذیل ۲۲ دستوری نکات اتفاق رائے سے طے کیا۔[1]

اسلامی مملکت کے دستور میں حسب ذیل اصول کی تصریح لازمی ہے۔

۱۔ اصل حاکم تشریعی وتکوینی حیثیت سے اللہ رب العلمین ہے۔

۲۔ ملک کا قانون کتاب وسنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا اصول نہ بنایا جاسکے گا۔

---

[1] معارف: یہ نکات جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا پنجاب یونیورسٹی لاہور کی وساطت سے موصول ہوئے ہیں جن کو انکے شکریے کے ساتھ شایع کیا جارہا ہے، شیخ صاحب اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں "آج کل مسلم ممالک میں شرعی قوانین کے نفاذ کا مسئلہ درپیش ہے، اس میں آج سے چالیس سال قبل حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سربراہی میں پاکستان کے جید اور سربرآوردہ علما (شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث) نے اسلامی مملکت کے لیے ۲۲ متفقہ دستوری نکات پیش کیے تھے جو تاریخی اور قانونی دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں، ان کی تفصیل شاید کسی کتاب یا رسالے میں شایع نہیں ہوسکی، تمام علمائے اسلام کا کسی امر پر متفق ہوجانا عجائب روزگار میں سے ہے۔"

نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا، جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں، جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیے جائیں گے۔

۳ ــــ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں، بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

۴ ــــ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۵ ــــ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانان عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶ ــــ مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کو لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی۔ جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں، یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷ ــــ باشندگان ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدود و قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادی

مذہب و مسلک، آزادی ذات، آزادی اظہار رائے، آزادی نقل و حرکت، آزادی اجتماع، آزادی اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

۹ ــــ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود و قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی، انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذاہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

۱۰ ــــ غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود و قانون کے اندر مذہب تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱ ــــ غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدود شرعیہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں گے ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے، ان میں غیر مسلم باشندگان ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲ ــــ رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳ ــــ رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا، البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

۱۴ ــــ رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی، یعنی وہ ارکان

حکومت اور منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

۱۵۔ رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزاً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶۔ جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

۱۷۔ رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

۱۸۔ ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اسے نافذ کریں گی۔

۱۹۔ محکمہ عدلیہ محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا۔ تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

۲۰۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

۲۱۔ ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی طور پر ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں، بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنھیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیاست کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا، مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۲۲۔ دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی، جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

اسمائے گرامی حضرات شرکاء مجلس

(۱) (علامہ) سید سلیمان ندوی (صدر مجلس ہذا) (۲) (مولانا) سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی پاکستان) (۳) (مولانا) شمس الحق افغانی (وزیر معارف۔ ریاست قلات) (۴) (مولانا) محمد بدر عالم (استاد الحدیث، دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد ٹنڈو اللہ یار سندھ) (۵) (مولانا) احتشام الحق تھانوی (مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد سندھ) (۶) (مولانا) محمد عبدالحامد قادری بدایونی (صدر جمعیۃ العلماء پاکستان۔ سندھ) (۷) (مولانا) محمد شفیع (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان) (۸) (مولانا) محمد ادریس (شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ۔ بہاولپور) (۹) (مولانا) خیر محمد (مہتمم مدرسہ خیر المدارس۔ ملتان شہر) (۱۰) (مولانا مفتی) محمد حسن (مہتمم مدرسہ اشرفیہ، نیلا گنبد، لاہور) (۱۱) (پیر صاحب) محمد امین الحسنات (مانکی شریف۔ سرحد) (۱۲) (مولانا) محمد یوسف بنوری (شیخ التفسیر، دارالعلوم الاسلامیہ، اشرف آباد۔ سندھ) (۱۳) (حاجی) خادم الاسلام محمد امین (المجاہد آباد، پشاور، صوبہ سرحد) خلیفہ حاجی ترنگ زئی) (۱۴) (قاضی) عبدالصمد سربازاری (قاضی قلات۔ بلوچستان) (۱۵) (مولانا) اطہر علی (صدر عامل جمعیۃ العلماء اسلام، مشرقی پاکستان) (۱۶) (مولانا) ابو جعفر محمد صالح (امیر جمعیۃ حزب اللہ۔ مشرقی پاکستان) (۱۷) (مولانا) راغب احسن (نائب صدر جمعیۃ العلماء اسلام مشرقی پاکستان) (۱۸) (مولانا) محمد حبیب الرحمان (نائب صدر جمعیۃ المدرسین سرسینہ شریف۔ مشرقی پاکستان) (۱۹) (مولانا) محمد علی جالندھری (مجلس احرار اسلام، پاکستان) (۲۰) (مولانا) داؤد غزنوی (صدر جمعیۃ اہلحدیث۔ مغربی پاکستان) (۲۱) (مفتی) جعفر حسین مجتہد (رکن بورڈ آف

تعلیمات اسلام۔ مجلس دستور ساز پاکستان) (۲۲) (مفتی حافظ) کفایت حسین مجتہد
(ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان، لاہور) (۲۳) (مولانا) محمد اسماعیل (ناظم
جمیعۃ اہلحدیث، پاکستان، گوجرانوالہ) (۲۴) (مولانا) حبیب اللہ (جامعہ دینیہ۔
دارالہدیٰ، ٹیڑھی خیرپور میرس) (۲۵) (مولانا) احمد علی (امیر انجمن خدام الدین
شیرانوالہ دروازہ۔ لاہور) (۲۶) (مولانا) محمد صادق (مہتمم مدرسہ مظہر العلوم۔
کھڈہ۔ کراچی) (۲۷) (پروفیسر) عبدالخالق (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام۔
مجلس دستور ساز، پاکستان) (۲۸) (مولانا) شمس الحق فریدپوری (صدر مہتمم مدرسہ
اشرف العلوم۔ ڈھاکہ) (۲۹) (مفتی) محمد صاحبداد عفی عنہ) سندھ مدرسۃ
الاسلام۔ کراچی) (۳۰) (مولانا) محمد ظفر احمد انصاری (سکریٹری بورڈ آف
تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز، پاکستان) (۳۱) (پیر صاحب) محمد ہاشم مجددی
(ٹنڈو سائیں داد، سندھ)

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کے سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، پوری کتاب اٹھارہ ابواب میں تقسیم ہے، جن میں نظریۂ خلافت، مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی، حقوق رعایا، بیت المال، احتساب، حرب و دفاع، خارجی معاملات وغیرہ، قریب قریب اسلامی دستور کے سب اصولی اور اساسی پہلو آگئے ہیں، اٹھارہواں باب غیر اسلامی نظریات سیاست سے متعلق ہے، جس میں موجودہ سیاسی نظریات مثلاً شخصیت، آمریت، جمہوریت، سوشلزم وغیرہ پر مختصر مگر بہت جامع بحث کی گئی ہے۔

مولفہ مولانا محمد اسحاق سندیلوی

قیمت:۔ ۴۰ روپے۔

"منیجر"

معارف کی ڈاک

مولانا غلام محمد صاحب کراچی کا مکتوب گرامی

کراچی۔ ۲۱ جولائی ۱۹۹۱ء

مولانائے محترم دامت الطافکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج عالی!

عرصہ ہوا آپ کا کرم نامہ ملا تھا، فی الوقت کوئی مضمون پیش خدمت نہ کرسکوں گا، عام صحت بھی کچھ ٹھیک نہیں، پھر آنکھوں کی خرابی الگ لاحق ہے، شاید اپریشن کرانا ہی پڑے۔

انگلستان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہٗ کے ایک جواں عمر، جواں ہمت عالم باخدا خلیفۂ مجاز مولانا یوسف متالا ہیں، سمر فیلڈ میں "مدینۃ العلوم الاسلامیۃ" کے نام سے لڑکے اور لڑکیوں کے دو الگ الگ رہائشی مدرسے چلا رہے ہیں جن میں اعلیٰ دینی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام ہے اور طلبہ و طالبات کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہے، موصوف کا ایک مکتوب کچھ روز پہلے موصول ہوا جس کا ایک اقتباس آپ کی اطلاع کے لیے درج ذیل ہے:۔

" میں اس وقت گجرات کے مشائخ و علماء کے حالات جمع کر رہا ہوں،
اس سلسلہ میں معلوم ہوا کہ گجرات پر سب سے زیادہ کام حضرت سید صاحب

نور اللہ مرقدہٗ کے بھانجے[1] مولانا سید ابو ظفر ندویؒ نے کیا ہے۔ گجرات سے متعلق ان کی اردو اور انگریزی کی تصانیف کا کچھ حصہ غیر مطبوعہ بھی ہے[2] انکے متعلقین یا ندوۃ المصنفین (دارالمصنفین مراد ہے) اعظم گڈھ کے منتظمین چاہیں تو اس کی طباعت میں انشاء اللہ العزیز ہم مالی امداد کرنے کو تیار ہیں، آپ تکلیف فرما کر کسی کو چند سطور تحریر فرما دیں تو بہتر ہوگا کہ مرحوم کی سالہا سال کی محنت کارآمد اور مفید و نتیجہ خیز ہو جائے گی۔"

اس سلسلہ میں معارف کے ذریعہ جواب عطا فرمائیں تو غالباً زیادہ نفع مند رہے گا۔

سال بھر سے زائد ہو چکا کہ "رموز سورۂ یوسف" کے زیر عنوان کچھ قلمی خدمت کی سعادت حاصل ہو گئی تھی، اس کی کتابت ہو چکی ہے، احباب پروف ریڈنگ کر رہے ہیں، چھپ جائے تو انشاء اللہ ارسال خدمت کروں گا۔

اب تو بس دعائے یوسفی ہی دل و جان سے نکلتی ہے "توفنی مسلماً والحقنی بالصّٰلحین" آپ بھی اس پر آمین فرما کر ممنون[3] فرمائیں۔ والسلام

ناچیز

غلام محمد

---

[1] معارف: مولانا سید ابو ظفر ندوی مرحوم حضرت سید صاحبؒ کے بھتیجے تھے [2] یہ درست ہے اور دارالمصنفین سے انکی اشاعت پر غور بھی کیا جا سکتا ہے لیکن دارالمصنفین میں موصوف کا کوئی غیر مطبوعہ مسودہ موجود نہیں ہے اور نہ یہی معلوم کہ وہ کہاں ہوگا؟ مولانائے مرحوم کی تین کتابیں دارالمصنفین سے شایع ہوئی ہیں (۱) تاریخ سندھ (۲) مختصر تاریخ ہند (۳) گجرات کی تمدنی تاریخ، موخرالذکر مسودہ کی صورت میں تھی جو انکی وفات کے بعد دارالمصنفین سے شایع ہوئی، ایک کتاب تاریخ گجرات ندوۃ المصنفین دہلی نے شایع کی تھی۔ بقیہ رسائل و تصانیف جو گجرات کے علماء و مشائخ اور تاریخ سے متعلق ہیں وہ گجرات ہی کے مطابع سے شایع ہوئی تھیں۔ مولانائے موصوف کی مطبوعہ کتابیں بھی اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں انکی اشاعت کا بھی الگ مسئلہ ہے [3] اس پر آمین کہنے کے ساتھ ہی ہم آپکے خاتمۂ مرض کی دعا بھی کرتے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

مولانا آزاد A COMMOMERTION VOLUME

از پروفیسر خلیق احمد نظامی، تقطیع متوسط، کاغذ طباعت عمدہ، خوبصورت سرورق، صفحات ۱۳۲، قیمت ۱۰۰ روپیے، پتہ: ادارۂ ادبیات دلی ۲۰۰۹، قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

مولانا ابو الکلام آزاد کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر جن مصنفین کی کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں ملک کے مشہور مصنف و مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا نام بہت نمایاں ہے، انھوں نے اردو اور انگریزی دونوں میں قابل ذکر اور یادگار کتابیں لکھیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں مولانا آزاد کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور تحریک آزادی کے ایک قائد، اتحاد ہندوستان کے پیامبر، مذہبی مفکر، فنون لطیفہ کے نکتہ شناس اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم وغیرہ عنوانات کے تحت مولانا آزاد کی بوقلموں شخصیت کے جلوے دکھائے گئے ہیں۔ آخری باب "چند ذاتی یادیں" سے فاضل مصنف اور مولانا مرحوم کے مخلصانہ روابط کا اندازہ ہوتا ہے، اس میں ایک جگہ اس کا ذکر ہے کہ ۵۵ء میں دارالمصنفین میں قرون وسطیٰ کی تاریخ ہند کی تدوین جدید کی ضرورت محسوس کی گئی تو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے ایما سے فاضل مولف نے اس کے خاکہ و منصوبہ کی تیاری میں حصہ لیا، مولانا کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے دارالمصنفین سے مولف کے اس تعلق پر مسرت کا اظہار کیا، ابو الکلامیات کے انگریزی داں

قدردانوں کے لیے یہ کتاب ایک نفیس تحفہ ہے۔

فکر کی غلطی از جناب مولانا عتیق احمد قاسمی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت طباعت اعلیٰ درجہ کی، صفحات ۳۵۲، قیمت ۵۰ روپیے، ناشر: مکتبہ الارشاد نمبر ۲۳۸ ابوالفضل انکلیو، نزد پولیس اسٹیشن، جامعہ نگر دہلی ۲۵۔

مولانا وحید الدین خاں ایڈیٹر الرسالہ اردو کے مشہور و مشاق اہل قلم ہیں، ان کی تحریریں عصری اسلوب میں موثر انداز اور دلنشیں پیرایۂ بیان میں ہونے کی وجہ سے شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی کتاب "علم جدید کا چیلنج" دینی و علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھی گئی، مگر ان کے شذوذ و تفرد اور بعض غیر معتدل افکار و خیالات مذہبی و علمی حلقوں میں ناپسندیدہ اور قابل اعتراض سمجھے گئے، زیر نظر کتاب میں ان کے اسی قسم کے خیالات کو موضوع بنایا گیا ہے مثلاً فضیلت انبیاء علیہم السلام شاتم رسولؐ کی سزا، صلح حدیبیہ، تصور جہاد، صحابۂ کرامؓ، فقہ اسلامی اور فقہاء مجتہدین، مجددین و مصلحین امت، معاصر شخصیات، فرقہ وارانہ فسادات اور بابری مسجد وغیرہ کے بارے میں مولانا وحید الدین خاں کی تحریروں کا احتساب اس طرح کیا ہے کہ ان سے پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ بھی ہوگیا ہے اور متعدد مفید علمی مباحث بھی سامنے آگئے ہیں، رد و ابطال میں شائستگی ہے مگر بعض محاوروں جیسے گل کھلانا، کھیل کھیلنا، رنگ بدلنا کا استعمال نہ بھی کیا جاتا تو کتاب کی تاثیر اور قوت استدلال میں کمی نہ آتی۔

نقوش چین از جناب مولانا محمد حنیف ملی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت طباعت بہتر، صفحات ۲۰۸، قیمت ۲۵ روپیے، ناشر: مجلس علم و ادب، اسلام آباد،

مالیگاؤں، مہاراشٹر۔

معہد ملت مالیگاؤں کے شیخ الحدیث مولانا محمد حنیف ملی کو تبلیغی جماعت کے ایک وفد کے ساتھ ۱۹۸۶ء میں چین کے سفر اور وہاں چار ماہ تک قیام کا موقع ملا، اس عرصہ میں ان کے قلب و نظر پر نگار خانہ چین کے جو عکس نقش ہوئے ان کو اس کتاب میں دلچسپ انداز میں بڑے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، گو ان کا سفر تبلیغی تھا مگر انھوں نے مسلمانوں کی دینی، علمی اور معاشرتی زندگی کا جائزہ لینے کے علاوہ عام چینی باشندوں کے امتیازات و خصائص، عادات و اطوار اور محاسن و نقائص کا بھی غیر جانبداری سے ذکر کیا ہے، اس میں چینی مسلمانوں کی دینی تڑپ اور بے چینی، اسلامی غیرت، علماء کے احترام قرآن مجید سے عشق، دل کی نرمی، طبیعت کی سادگی اور مہمان نوازی وغیرہ کے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ قابلِ رشک ہیں، مصنف نے چینی باشندوں کی عام خوشحالی، طبقاتی عدم امتیاز، نظم و ضبط اور وقت کی پابندی نیز ان کے تمدن و شائستگی کو اسلامی اثرات کا نتیجہ بتایا ہے، چینی طریقۂ تعلیم کے سلسلے میں یہ واضح کرنے کے بعد کہ "کمیونزم فکر و خیال کی تباہی اور انسانی وجود کے لیے ناسور ہے"۔ بتایا ہے کہ اگر قومی بنیادوں پر تعلیم کا نظام بنایا جائے تو وہ سب کے لیے مفید تر ہوگا۔ چینی کمیونزم اور روسی اشتراکیت کے فرق سے لے کر تیلیوں سے کھانا کھانے تک کی جزئیات کا انھوں نے احاطہ کیا ہے، پندرہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، ہر باب کے عنوان کے انتخاب میں بھی مصنف کا حسن ذوق کارفرما ہے، البتہ کثرت آبادی کے مفہوم میں 'نوآبادیات' کا لفظ صحیح نہیں، 'حکومت کے بائیں ہاتھ کے ملازمین' کی تعبیر مبہم اور 'سرپردۂ زرگاری' غالباً سہو کتابت ہے"، گلابی سردی اور غضب کی؟

گلابی سردی تو موسم سرما کے شروع کے ہلکے جاڑے کو کہتے ہیں۔

اسلام میں خدمت خلق کا تصور از جناب مولانا سید جلال الدین عمری،

تقطیع متوسط، کاغذ کتابت طباعت سرورق عمدہ، صفحات ۱۷۶، قیمت ۲۵ روپیے

ناشر: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ۔

خدمت خلق کی ضرورت و اہمیت پر فاضل مولف کا ایک رسالہ 'انسانوں کی خدمت' کے نام سے چند برس پہلے شایع ہوا تھا، اب اس کتاب میں انھوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں تصور خدمت خلق کو تفصیل و وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے، اعزاء و اقارب، ہم مذہب و ہم وطن، غرباء و مساکین کی خدمت کے علاوہ مستقل اور پائیدار خدمات اور بعض حدود و قیود کے ساتھ رفاہی خدمات اور خدمت خلق کے اداروں اور تنظیموں کی اہمیت کو عہد حاضر کے تقاضوں کی رعایت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دید و دریافت از جناب شمس بدایونی، متوسط تقطیع، مناسب کاغذ کتابت اور طباعت، صفحات ۲۳۲، قیمت ۱۲ روپیے، ناشر: روشن پبلیکشنز، روشن محل، سوتھا، بدایوں

روہیل کھنڈ کے شہر بدایوں کی مردم خیزی اور صدیوں سے اسکی علم پروری اور ادب نوازی مسلم تاریخ ہند کا ایک زریں باب ہے، جناب شمس بدایونی نے جو بدایوں کی دیرینہ روایات کے امین ہیں، زیر نظر کتاب میں وہاں کے معروف و غیر معروف ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا ہے، ایک مضمون 'غالب بدایوں میں' کے عنوان سے ہے، شہر بدایوں کے تعارف اور فانی بدایونی کی ببلوگرافی سے کتاب کی قدر و قیمت دوچند ہوگئی ہے۔

(ع۔ص)